بحکم خدا و خرد

Ex Libris

Asaf Ali-Asghar Fyzee

Presented to the Library of

The University of Jammu & Kashmir

June 1, 1957

علم و عمل ۳، ۱۹

تجزیہ ۳۰، ۳۱-۳۲

تبلیغی دور کی خصوصیات ۳۴، ۳۷، ۳۸۔

اسلام کا پہلا مدرسہ ۴۵ ہندوستان کا ۴۶

رہبانیہ فی التعلیم ۱۰۳-۱۰۴

ابن خلدون تعلیم قرآن ۱۵۰

علمی فضیلت ۱۳، ۱۴، ۱۵

استاد و شاگرد کے باہمی تعلقات ۸۱ وغیرہ

تحصیل علم کی مشقت ۸۲
ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک ۸۸
شادی کرنے سے علم میں خلل ۱۰۳
ابن خلدون اور تعلیم قرآن ص ۱۵۰

اسلامی نظام تعلیم 1938

اصغر

سلسلۂ دار المصنّفین

(۵۶)

اسلامی نظامِ تعلیم

از

سید ریاست علی ندوی

رفیق دار المصنّفین

باہتمام

مولوی مسعود علی صاحب ندوی

مطبوعہ

معارف پریس اعظم گڈھ

سنہ ۱۳۵۷ھ
۱۹۳۸ء

٣٤٠٥٠٠١٢٩٤
١٥٢٨
Allama Iqbal Library
19049
KASHMIR UNIVERSITY LIBRARY
No. 19049
25-11-60
SRINAGAR
ST/82
ST 01
Ro

فہرست مضامین

"اسلامی نظامِ تعلیم"

نظامِ مدارس و دار الاقامہ

اساتذہ کے فرائض

۸۱ - ۱۲۰

حلقۂ درس

۱۲۱ - ۱۲۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

آجکل فن تعلیم کو جو اہمیت حاصل ہے وہ ظاہر ہے، ہر طرف ٹریننگ اسکول اور کالج کھلے ہین، مدرس تیار کئے جاتے ہین، فن تعلیم پر نئی نئی کتابین لکھی جاتی ہین، اور نئے نئے نظریے آزمائے جاتے ہین،

کہتے ہین کبھی روے زمین پر مسلمانون کی قوم بھی آباد تھی، اس کی ترقی و عروج کے عہد مین بھی اس فن پر کتابین لکھی گئی تھین، اور علماے اہل تدریس نے اپنے خیالات کتابون اور رسالون مین تحریر کئے تھے، اور کتاب و سنت، بزرگون کے واقعات اور تجربون سے تعلیم کے کچھ گر انھون نے سمجھے تھے، اور ان کو اصول و قواعد کی حیثیت مین ترتیب دیا تھا،

ضرورت تھی کہ اس فن پر مسلمان علماء نے جو کتابین لکھی ہین یا اپنی تصنیفات مین تعلیم سے متعلق جو نظریے بتائے ہین، یا متفرق خیالات ظاہر کئے ہین، یا بزرگوں کے تعلیمی واقعات و معاملات سے جو اصول آج سمجھے جا سکتے ہین، ان کو ترتیب سے یکجا کر دیا جائے،

دارالمصنفین کی طرف سے اس کام کا ارادہ اکثر ہوتا رہا، خوش قسمتی سے دو سال ہوے کہ مسلم تعلیمی کانفرنس علی گڈھ نے اپنے پچاس سال کی عمر کی جوبلی منائی، اس تقریب سے "اسلامی نظام تعلیم" کی ترتیب کا بہت اچھا موقع ہاتھ آیا، چنانچہ دارالمصنفین کے لائق

رفیق مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی نے اس کام کے لئے آمادگی ظاہر کی، اور ڈیڑھ دو مہینے کی محنت مین یہ مقالہ بلکہ رسالہ لکھا مین نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ کانفرنس کے لئے اس کا خلاصہ کرلین، باقی پورا رسالہ معارف مین چھپے، پھر الگ رسالہ بنے، چنانچہ اسی مشورہ پر عمل ہوا،

مصنف نے کتابون کی ورق گردانی، واقعات کی تلاش، اصولون کے استنباط، اور مسائل کی چھان بین مین جو زحمت اٹھائی ہے وہ کتاب کے ہر صفحہ سے ظاہر ہے، یہ اسلامی نظامِ تعلیم کا آئینہ ہے جس مین اس بحث کا ہر پہلو پوری طرح نمایان ہے، امید ہے کہ اہلِ علم اس کی پوری قدر کرین گے، اور اہلِ تعلیم اس سے فائدہ اٹھائین گے،

سید سلیمان ندوی

۱۵ رجمادی الثانیہ ۱۳۵۷ھ

دار المصنفین، اعظم گڈھ،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی نظام تعلیم

اسلامی نظام تعلیم کی سرگذشت پر ابھی تک مشرق و مغرب کے اہلِ علم کو بہت کم توجہ کرنے کا موقع ملسکا ہے، اور جن لوگوں نے اس پر قلم اٹھایا ہے، وہ معلومات کی کمی کی بنا پر عجز کے اقرار کے بغیر آگے نہ بڑھ سکے، اور اس سلسلہ میں اب تک برہان الدین زرنوجی کے ایک رسالہ تعلیم المتعلم کے سوا کوئی دوسرا قیمتی ماخذ یورپ کے اہلِ علم کے سامنے موجود نہیں رہا،

چنانچہ اس موضوع پر سب سے پہلے ۱۷۰۹ء میں موسیو رلینڈس (Ralandus) نے زرنوجی کے اس رسالہ کو جرمنی سے شائع کیا اور غالباً جرمن مستشرق ڈاکٹر فریڈریخ وسٹیفیلڈ (Friedrich-Wustefeld) نے اسی رسالہ کا ترجمہ پہلی مرتبہ جرمن زبان میں کیا، پھر ۱۸۳۰ء میں موسیو کاسباری نے اسے لائبزک سے لاطینی زبان کے ترجمہ اور موسیو فلیشر کے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا[۱]، اس کے بعد ایک دوسرے فاضل مستشرق ڈاکٹر دانیال ہانے برک (Daniel Haneberg.) نے ۱۸۵۰ء میں میونخ یونیورسٹی میں ایک مختصر اور سرسری معلومات کا حامل مقالہ اس موضوع پر پڑھا، جسے ایک مسلمان فاضل نے اسلامی

---

[۱] معجم المطبوعات العربیہ جلد اص ۹۶۹ و اکتفاء القنوع بما ہو المطبوع، ص ۱۹۰،

نظامِ تعلیم" کے نام سے ہندوستانی زبان میں بھی منتقل کر دیا ہے، اس میں ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں :-

"تاریخ تمدن کا یہ پہلو نہایت اہم ہے اور حیرت ہے کہ باوجود اس قدر اہم ہونے کے اب تک بہت کم علماء نے اسے اپنی توجہ کا مستحق سمجھا ہے، بلا شبہہ اس موضوع کے بعض حصّوں پر کافی محنت صرف کی گئی ہے، لیکن جزئیات کے متعلق کئی ایک سوال ہیں جن کی تحقیق ابھی باقی ہے، جہاں تک اس موضوع کی مجموعی حیثیت کا تعلق ہے، خود سلین (Slane. جس نے اسلامی مدارس کا مختصر خاکہ ابن خلکان کے ترجمہ کی دوسری جلد میں کھینچا ہے) نے بھی اس سے زیادہ جرأت نہیں کی کہ محض ایک مختصر خاکہ کھینچ دے"[1]

جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب نے "تاریخ التعلیم" کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے، اس میں یونان اور روما پر تو صفحوں کے صفحے لکھے گئے ہیں، مگر جب عربوں کے دورِ حکومت کی باری آئی، تو انہیں اعتراف کرنا پڑا، کہ

"اس امر کے متعلق معلوم کرنے کے لئے کہ مسئلہ تعلیم کی نسبت اہلِ عرب کے کیا خیالات تھے بہت کم مواد موجود ہے، تعلیم کی تاریخ پر اہلِ یورپ میں جن لوگوں نے تصانیف کی ہیں، اگرچہ وہ اپنی تصانیف میں اوائلِ زمانہ کے حالات درج کرتے ہیں لیکن اہلِ عرب کے زمانہ کو قطعاً چھوڑ جاتے ہیں"[2]

درحقیقت اس وقت تک اسلامی نظامِ تعلیم پر جو کچھ مواد فراہم ہوا ہے، وہ مولینا شبلی نعمانی مرحوم کے چند مضامین کے مجموعہ کے باہر نہیں ہے، لیکن علامہ موصوف نے ان میں زیادہ تر اسلامی مدارس پر توجہ رکھی ہے، اگرچہ اسلامی نظام تعلیم پر بھی انھوں نے مضامین لکھے ہیں لیکن ان میں ندوۃ العلماء کے تعلق سے زیادہ تر ہندوستان کی اسلامی درسگاہوں کے نصاب پر نظر ڈالی گئی ہے، نفس اصول و طریق تعلیم، اسلامی نظامِ تعلیم کے رو سے اساتذہ وطلبہ کے فرائض، اور مدارس اور دارالاقامہ کے نظم ونسق وطرز بود وماند وغیرہ پر انہیں بھی توجہ فرمانے کا موقع نہیں ملا، مولینا عبد السلام

---

[1] اسلامی نظام تعلیم ص ۱ [2] تاریخ التعلیم ص ۴۶

ندوی نے التربیۃ الاستقلالیہ کے مقدمہ میں جسے ایجوکیشنل کانفرنس نے شائع کیا ہے، اسلام تعلیم پر نظر ڈالی ہے لیکن ان کی توجہ بھی زیادہ تر مسئلہ نصاب اور اسکی اصلاح پر مبذول رہی ہے، اور نواب صدر یار جنگ مولینا حبیب الرحمن خان شروانی نے "علماء سلف" کے سوانح میں جستہ جستہ ان کی طالب علمی کے حالات بھی لکھے ہیں،

قدیم ماخذ میں فن تعلیم پر مباحث قدیم عربی ماخذوں پر اگر نظر ڈالی جائے تو علماء اسلام میں سے جن لوگوں نے اسلامی اصول و طریق تعلیم پر توجہ کی، ان میں امام اعظم ابو حنیفہ، امام بخاری، حافظ ابن عبد البر، امام غزالی، برہان الدین زرنوجی، قاضی ابن الجماعہ، محمد بن ابوزید اور علامہ ابن خلدون کے نام لئے جا سکتے ہیں،

امام اعظم علیہ الرحمۃ کا ایک رسالہ کتاب العالم والمتعلم کے نام سے ہے، جسے مجلس احیاے معارف نعمانیہ حیدرآباد نے شائع کیا ہے، یہ رسالہ اگرچہ عقائد و کلام کے مباحث پر ہے لیکن وہ مباحث مکالمہ کے طریقہ سے متعلم و عالم کے سوال وجواب میں بیان کئے گئے ہیں، اور اس سے متعلم کے طریق سوال وجواب، اور معلم کے طریق افہام و تفہیم و شفقت و محبت پر بھی روشنی پڑتی ہے،

امام بخاری نے اپنی صحیح میں ایمان کے بعد علم ہی کو جگہ دی ہے، چنانچہ کتاب الایمان میں ایمانیات سے متعلق احادیث جمع کرنے کے بعد کتاب العلم میں علم کے متعلق احادیث اور اخبار و آثار جمع کئے ہیں، جن سے علم کی فضیلت، علم و تعلیم کی اشاعت، تعلیم کے لئے تحریص و تشویق، عالم و متعلم کے فرائض اور طالب علموں کی تادیب وغیرہ کے مباحث اخذ کئے جا سکتے ہیں،

امام بخاری کی پیروی میں دیگر ارباب سنن و کتب احادیث نے بھی اپنی کتابوں میں کتاب العلم کے تحت یہ امور پیش کئے ہیں، اور حافظ ابن حجر نے بخاری کی شرح فتح الباری میں معلومات بڑھائے ہیں،

حافظ ابن عبد البر متوفی ۴۶۳ھ کو یہ شرف تقدم حاصل ہے، کہ انھوں نے اصول علم و تعلیم، مفہوم علم، فضیلت طلب علم، آداب تعلم، اور علماء و طلبہ کے فرائض و اخلاق پر کتاب جامع بیان العلم وفضلہ میں تفصیلی مباحث پیش کئے، اور احادیث و اخبار و آثار و اقوال سے استشہاد لائے، اس کا اختصار احمد بن عمر محمصانی

بیروتی ازہری نے مختصر جامع بیان العلم وفضلہ کے نام سے کیا، اور اُسے ۱۳۲۰ھ ہجری میں مطبع موسوعات مصر سے شائع کیا ہے،

امام غزالی متوفی ۵۰۵ھ نے طریقۂ درس وتدریس، فضیلتِ علم، اساتذہ وتلامذہ کے فرائض ان دونوں کی باہمی معاشرت کے آداب، احیار العلوم میں قلم بند فرمائے ہیں، اور علوم کی تقسیم کرکے ان کے درجات وامتیازات دکھائے ہیں، یہ مباحث احیار العلوم جلد اوّل کتاب العلم اور جلد ثالث کتاب شرح عجائب القلوب میں مذکور ہیں،

محمد بن ابوزید نے معلمین ومتعلمین کے فرائض پر ایک کتاب لکھی تھی، لیکن اس کا سُراغ بجز اس کے اور کوئی نہیں ہی، کہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں اسکا تذکرہ کیا ہے، اور اس نے فن تعلیم پر جو کچھ لکھا ہی اس میں یہ کتاب بھی اسکی ماخذ رہی ہے،

علامہ **ابن خلدون** متوفی ۸۰۸ھ نے اپنے مقدمہ میں فن تعلیم پر ایک مستقل باب لکھا ہے، اور بعض دوسری مناسبتوں سے اسی مقدمہ میں دوسرے مقاموں پر بعض تعلیمی مباحث درج کئے ہیں، اور ان میں علم وتعلیم کی ترقی کے اسباب ووجوہ اور تعلیم کے اصول وطریق پر فلسفیانہ نظریے قائم کئے ہیں،

سیر وتراجم کی عام کتابوں جیسے وفیات الاعیان ابن خلکان، تذکرۃ الحفاظ ذہبی، طبقات الشافعیہ سبکی حسن المحاضرہ سیوطی اور تاریخ تمدن کی کتابوں میں سے خطط مصر مقریزی وغیرہ میں مختلف ائمہ اور علمار کے سوانح اور شہروں کے مدارس کے ذکر میں جستہ جستہ تعلیمی مباحث ملتے ہیں،

فن تعلیم پر سب سے پہلی کتاب، یوں تو فن تعلیم پر مستقل حیثیت سے جو کتاب سب سے پہلے لکھی گئی، وہ ابن عبد البر کی جامع بیان العلم قرار پا سکتی ہے، لیکن اس کا ایک گونہ تعلق تعلیم وتعلم کے ساتھ علمار کے مقامِ علم وحقیقتِ فقہ وقیاس سے بھی ہے، اس لئے فنِ تعلیم پر سب سے پہلی مستقل کتاب جو خاص اسی موضوع پر تصنیف ہوئی، اسی مذکورۂ بالا رسالہ تعلیم المتعلم کو قرار دیا جا سکتا ہے،

تعلیم المتعلم یہ برہان الدین زرنوجی کی تصنیف ہے، جو چھٹی صدی میں گذرے ہیں، اور ہدایہ کے مشہور مصنف علامہ برہان الدین کے شاگردوں میں تھے، اس رسالہ میں تعلیم کا مقصد، استادوں کے انتخاب، عالموں کی عزت، اسباق اور ان کی مقدار اور ترتیب اور علماء اور طلبہ کے اخلاق و فرائض پر اختصار کیساتھ نظر ڈالی گئی ہے، اور علماء اور ائمہ کے اقوال اور ان کی تعلیم و تعلم کے واقعات سے مثالیں دی گئی ہیں،

اس لئے اس رسالہ کو عام مقبولیت حاصل ہوئی، لاطینی اور جرمن زبانوں میں ترجمہ ہونے کے علاوہ ترکی زبان میں بھی اسے شیخ عبدالمجید بن نصوح نے ارشاد الطالبین فی تعلم المتعلمین کے نام سے منتقل کیا اور ۹۹۶ھ میں شیخ ابراہیم بن اسماعیل نے اس کی شرح سلطان مراد ثالث کے زمانہ میں لکھی، ہندوستانی زبان میں بھی اس رسالہ کا ترجمہ الرفیق الفہیم لطریق التعلیم کے نام سے مولوی محمد معین الدین صاحب (محافظ کتب خانہ حبیب گنج علی گڈھ) نے کیا ہے، یہ ۱۳۵۰ھ میں حبیب گنج علی گڈھ سے شائع ہوا ہے،

اصل رسالہ متعدد مرتبہ چھپ چکا ہے، جیسا کہ اوپر گذرا، ۱۷۰۹ء میں جرمنی میں چھپا، پھر ۱۸۳۸ء میں لائبزک میں اس کے بعد ۱۲۶۵ھ میں ہندوستان میں شہر مرشدآباد میں چھاپا گیا، پھر ۱۹۰۱ء میں قازان میں، اس کے بعد ۱۲۸۶ھ میں تیونس میں ایک مختصر شرح کے ساتھ چھپا، پھر یہی تیونس کا نسخہ ۱۲۹۲ھ میں استانہ میں چھاپا گیا، اسکے بعد ۱۳۰۷ھ میں پھر قازان میں چھپا، اور ۱۸۹۰ء میں مصر میں، پھر ۱۳۰۰ھ اور ۱۳۰۷ھ میں مطبوع ہوا[1] علاوہ ازیں ابن اسمٰعیل کی شرح کے ساتھ بھی یہ چھپتا رہا، چنانچہ ۱۳۰۱ھ اور ۱۳۱۱ھ میں یہ قسطنطنیہ میں چھاپا گیا، اور آخری اڈیشن ۱۳۳۴ھ میں مصر سے شائع ہوا[2]،

اس رسالہ کے ان بکثرت اڈیشنوں کی اشاعت سے یہ اندازہ ہوتا ہے، کہ یہ اس فن کا مقبول عام رسالہ رہا ہے، اور اب تک اہل علم کا اس فن میں اسی پر مدار تھا،

تذکرۃ السامع والمتکلم فی ادب العالم والمتعلم لیکن اب حیدرآباد کی مجلس دائرۃ المعارف ہمارے شکریہ کی مستحق ہے، کہ اس فن میں

[1] معجم المطبوعات العربیۃ جلد ا ص ۹۶۹، [2] ایضاً، واکتفاء القنوع ص ۱۹۰،

اسکی کوششوں سے ایک دوسری قابلِ قدر کتاب تذکرۃ السامع والمتکلم فی ادب العالم والمتعلم مولینا سید ہاشم صاحب ندوی کی عالمانہ تصحیح وتحشیہ کیساتھ شائع ہوئی ہے، اس کتاب سے اس موضوع کے بہت سے قیمتی معلومات سامنے آگئے ہیں، جن میں خصوصًا قدیم اسلامی تعلیم کے اصول کی تشریح کے ساتھ تحصیلِ علم کے طریقے استادوں اور شاگردوں کے باہمی تعلقات، شاگردی کے آداب، اور مدارس اور دار الاقامہ کے نظم ونسق اور رہنے سہنے کے طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، پھر محشی نے اپنے حواشی میں سیر تاریخ، رجال اور حدیث کی مستند کتابوں سے ایسے بہت سے قیمتی معلومات نئے مذاق کے مطابق عنوانات قائم کرکے بڑھائے ہیں، جنسے اسلامی عہد کی تعلیم کے طریقوں اور نظام کے مزید حالات سامنے آگئے ہیں،

تذکرۃ السامع، قاضی بدر الدین ابو اسحٰق محمد بن ابراہیم بن سعد اللہ بن جماعہ کنانی معروف بہ قاضی ابن جماعہ متوفی ۷۳۳ھ کی تصنیف ہے، موصوف مصر وشام کے مختلف مقاموں پر قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز رہنے کے علاوہ کسی نہ کسی مشہور درسگاہ میں درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، پھر مصر میں صدر اساتذہ کے منصب پر سرفراز رہے[1] اسلئے انھیں تعلیمی معاملات کا عملی تجربہ حاصل تھا، اور انھوں نے جو کچھ لکھا وہ اپنے عملی تجربہ کے بعد لکھا ہے، ان کے بیان کا اسلوب یہ ہے، جیساکہ محشی نے دکھایا ہے، کہ پہلے وہ اصول بیان کرتے ہیں، پھر ان سے فروع نکالتے ہیں، اس کے بعد موقع کے لحاظ سے واقعات اور اقوال نقل کرتے ہیں، انھوں نے درس وتدریس کے طریقہ اور استادوں اور شاگردوں کے باہمی تعلقات میں جابجا ان کو مشورے دیئے ہیں، وہ درسگاہوں میں مدرس تھے، اور صدر اساتذہ کے منصب پر فائز تھے، اس لئے یہ بجا قیاس کیا جاسکتا ہے، کہ انھوں نے جو کچھ مشوروں کے طور پر لکھا ہے، ان پر اپنی نگرانی میں عمل بھی کرایا ہوگا، علاوہ ازیں انھوں نے اس میں متقدمین کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے، چنانچہ اس کتاب میں متاخر مصنفین کے طرزِ تصنیف

[1] قاضی ابن جماعہ کے سوانح کی تفصیل کے لئے دیکھو، طبقات الشافعیہ سبکی جلد ۵ ص ۲۳۰، ۲۳۳، الدرر الکامنہ ابن حجر جلد ۳ صفحہ ۳۸۰، ۲۸۳، شذرات الذہب ابن عماد حنبلی جلد ۶ صفحہ ۱۰۵، ۱۰۶

کے مطابق امام غزالی کی احیاء العلوم، ابن عبد البر کی جامع بیان العلم اور زرنوجی کی تعلیم المتعلم کی اصل عبارتیں جابجا نقل کی گئی ہیں، یہ کتاب پانچ بابوں پر تقسیم کی گئی ہے،

۱۔ "علم اور اہل علم کی فضیلت"

۲۔ "اساتذہ کے آداب و تہذیب اپنی ذات کے متعلق، اور اپنے شاگردوں کے ساتھ، اور درس کے حلقہ میں"

۳۔ "طلبہ کے فرائض، اور اخلاق، اپنی ذات کے لئے، اور اپنے استادوں اور ساتھیوں کے ساتھ، اور حلقہ درس میں"

۴۔ "طلبہ اور ان کی کتابیں"

۵۔ "مدارس، مدرسین، اور طلبہ کے آداب اور طریقے"

تذکرۃ السامع کے حواشی

تذکرۃ السامع کے محشی نے بھی اپنے حواشی اور تعلیقات میں مصنف کے اسلوب بیان کی پیروی کی ہے، اگر کتاب میں ایسے قواعد اور اصول نظر آئے جنھیں مصنف نے لکھ کر کوئی مثال دیئے بغیر چھوڑ دیا ہے، تو ایسے موقعوں میں سے اکثر جگہ محشی نے مثالیں دیکر دکھایا ہے، کہ اسلامی عہد میں ان پر عمل ہوتا تھا، کتاب میں درس و تدریس کے طریقے اور درس و تدریس کے حلقہ میں نشست برخاست کے آداب کے ایسے بہت سے جزئی معلومات ہیں جو کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتے، محشی نے مختلف کتابوں کے اقتباسوں سے ان کی مثالیں واضح کی ہیں،

مقالہ کے مآخذ اور عنوان مباحث

اس لئے ضرورت تھی کہ اصل کتاب اور اس کے ان قیمتی حواشی کو نئی ترتیب اور اسلوب میں ہندوستانی زبان میں منتقل کیا جائے، حسن اتفاق کہ ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی کے اس اجلاس کے توسط سے اس کا موقع جلد ہاتھ آگیا، اور مناسب نظر آیا کہ "اسلامی نظام تعلیم" کے عنوان پر فن تعلیم کے متعلق تمام مذکورۂ بالا ماخذوں اور خاص طور پر تذکرۃ السامع اور اس کے حواشی سامنے رکھ کر چند

مباحث حسبِ ذیل عنوانون میں پیش کئے جائین،:-

۱- اسلام کا تعلیمی نصب العین،

۲- اسلامی نظام تعلیم کے تین دور،

۳- نظام مدارس و دار الاقامہ،

۴- اساتذہ کے فرائض،

۵- طلبہ کے واجبات،

۶- حلقۂ درس (کلاسس)

۷- طریقۂ تعلیم و نصاب درس،

۸- طرز تعلیم و نصاب درس کی چند خامیان، اور ان کی اصلاح کی کوششین،

(حاشیہ ص ۳۹) لہ محشی نے جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے، اور جن کے جابجا اقتباسات درج کئے، وہ حسب ذیل ہین،:-

۱- خطط مصر مقریزی، ۲- تذکرۃ الحفاظ ذہبی، ۳- وفیات الاعیان ابن خلکان،
۴- الشقائق النعمانیہ طاش کبری زادہ، ۵- تعلیم المتعلم زرنوجی، ۶- احیاء العلوم غزالی،
۷- طبقات الشافعیہ سبکی، ۸- مختصر جامع بیان العلم ابن عبد البر ۹- ترمذی،
۱۰- ابن ماجہ، ۱۱- کنز العمال ۱۲- ابو داؤد،
۱۳- صحیح بخاری، ۱۴- صحیح مسلم ۱۵- فتح الباری ابن حجر،
۱۶- رحلۃ ابن بطوطہ ۱۷- مفتاح السعادہ ۱۸- فہرست کتب خانہ خدیویہ،

راقم سطور نے ان ماخذوں کے ان اقتباسوں سے جو حواشی میں درج ہیں، فائدہ اٹھایا ہے، علاوہ ازین ان کتابوں سے ایسے بہت سے نئے معلومات جو حواشی میں موجود نہ تھے، اصل کتابوں سے بڑھائے ہیں، پھر اس

تعلیم المتعلمین
اسلام کا علمی نصب العین

اسلام نے علم اور دین دونوں کے دامنوں کو ایک دوسرے سے اس طرح باندھا ہے، کہ وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوسکتا، بلکہ قرآن مجید کی سب سے پہلی آیت اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ (اس کا نام لیکر پڑھ جس نے پیدا کیا) اسی حقیقت کو لیکر اتری ہے، اور اشارہ سے بتاتی ہے، کہ پیدا کرنے والے نے ہمکو پڑھنے اور سیکھنے ہی کے لئے بنایا ہے،

اسلام کی نظر میں تعلیم کا مقصد، اسلام کی نظر میں تعلیم و تعلّم کا مقصد خالص رضائے الٰہی کی طلب ہے، اور بس، اس میں کسی دنیاوی غرض کا میل نہیں، بلکہ اسکی نظر میں تعلیم کا اصلی مقصد صرف انسانی پیدائش کے منشا کو پورا کرنا، اچھے اخلاق سے آپ آراستہ ہونا، اور دوسروں کو آراستہ کرنا، اپنے علم کی روشنی سے

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰) مقالہ کی تسوید میں ذیل کی چند دوسری کتابوں سے مدد لی گئی ہے:-

۱- رحلۃ ابن جبیر	۲- معجم البلدان یاقوت حموی	۳- مقدمہ ابن خلدون،
۴- معالم الایمان ابن ناجی	۵- بغیۃ الوعاۃ سیوطی،	۶- صبح الاعشیٰ قلقشندی،
۷- الدرر الکامنہ ابن حجر	۸- عیون الانباء ابن ابی اصیبعہ	۹- استیعاب،
۱۰- مسند احمد بن حنبل	۱۱- اسد الغابہ	۱۲- الوافی بالوفیات صفدی
۱۳- حسن المحاضرہ سیوطی،	۱۴- یعقوبی،	۱۵- سیرۃ عمر بن عبد العزیز ابن جوزی
۱۶- معجم المطبوعات العربیہ،	۱۷- اکتفاء القنوع	۱۸- اکبرنامہ ابو الفضل،
۱۹- اخبار الاخیار،	۲۰- مقدمۃ التربیۃ الاستقلالیہ	۲۱- علمائے سلف،
۲۲- خیام،	۲۳- الغزالی،	۲۴- تاریخ صقلیہ،
۲۵- اسلامی نظام تعلیم،	۲۶- تاریخ التعلیم،	

جہل اور نادانی کے اندھیرے کو دور کرنا، نہ جاننے والوں کو سکھانا، بھولے بھٹکوں کو راہ دکھانا، حق کو پھیلانا اور باطل کو مٹانا ہے،

علم وعلماء کے فضائل قرآن مجید میں

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اہل علم کی خوبیاں اور بڑائیاں گن گن کر ان کے مرتبے بڑھائے، چنانچہ اسلام کی مقدس کتاب قرآن مجید میں ایسی بہت سی آیتیں ہیں جن میں علم، تعلیم اور علماء کی بزرگی اور بڑائی بیان کی گئی ہے، سورہ مجادلہ میں ہے:-

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ، (۲۶)	تم میں سے جو ایمان لائے، اور جنھیں علم دیا گیا، اللہ ان کے درجے بلند کرے گا،

امام غزالی لکھتے ہیں، کہ حضرت ابن عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں، کہ "علماء کو عام مسلمانوں پر سات سو درجہ زیادہ فضیلت دی گئی ہے، اور ان درجوں کے باہمی فرق کیلئے ان میں سے ہر دو درجوں کے درمیان پانسو سال کی مدت کا فصل سمجھنا چاہئے"

سورہ آل عمران میں ہے:-

شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهٗ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَأُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ، (ع-۲)	اللہ نے گواہی دی، کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں، اور فرشتوں نے، اور علم والوں نے گواہی دی، حاکم انصاف کا،

اس آیت سے امام غزالی نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے، کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنا نام لیا، پھر فرشتوں کا، پھر اپنے سے تیسرا درجہ اہل علم کو عطا کیا، اور یہ اہل علم کے شرف وفضیلت کی ایک نشانی ہے،

سورہ زمر میں ہے:-

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ، (ع-۱)	کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہوں گے،

نحل میں آیا ہے:-

فَسْئَلُوا اَهْلَ الذِّكْرِ (ع-۵) اہلِ ذکر سے پوچھو،

امام غزالی نے اس آیت سے علم والوں سے تعلیم حاصل کرنے کی تلقین دکھائی ہے،

سورۂ عنکبوت میں فرمایا:-

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ، (ع-۵) یہ مثالیں ہم نے لوگوں کے لئے بیان کیں، اور انھیں سوائے علم والوں کے دوسرے نہیں سمجھ سکتے،

اس کے بعد اسی سورہ میں ارشاد ہوا:-

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِي صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَا اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ، (ع-۵) بلکہ جن لوگوں کو علم دیا گیا، ان کے نزدیک تو یہ (قرآن) کی کھلی آیتیں ہیں، اور ہماری نشانیوں سے سوائے ظلم کرنے والوں کے کوئی انکار نہیں کرسکتا،

پھر سورۂ بینہ کی یہ آیت:-

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ، جَزَاؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا، رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ، (ع-۱) بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے، وہی لوگ بہترین خلائق ہیں، ان کا بدلہ ان کے پروردگار کے یہاں رہنے کے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں سدا رہیں گے، اللہ ان سے خوش ہوا اور وہ اس سے خوش، یہ (اجر) اسکے لئے ہے جو خدا

پڑھ کر سورۂ فاطر میں یہ ارشاد خداوندی ملاحظہ ہو:۔

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں،

ان دونوں آیتوں سے امام غزالی اور قاضی ابن جماعہ یہ نکتہ پیدا کرتے ہیں، کہ علماء ہی اللہ سے ڈرتے ہیں، اور جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں، وہ بہترین خلائق ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ قرآنی شہادت کے رو سے علما، بہترین خلائق ہیں،[1]

علامہ زرنوجی نے حضرت آدم اور ملائکہ کے قصہ میں دکھایا ہے، کہ انسان کا حقیقی شرف اس کا علم ہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسی کے ذریعہ ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر فضیلت دی اور سجدہ کرنے کے قابل ٹھہرایا،[2]

علم و تعلیم اور تحصیل علم اور علما کے فضائل احادیث میں

حدیثوں میں بھی علم و علماء کی بہت سی فضیلتیں بیان کی گئی ہیں، اور انھیں دین کی خاطر علم حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے، بخاری میں ہے :۔

"اللہ جس کے ساتھ بھلائی چاہتا ہے، اسے دین میں سمجھ عطا کرتا ہے"،[3]

عالم اور عابد کے موازنہ میں آپ نے فرمایا :۔

"عابد پر عالم کی فضیلت ایسی ہی ہے، جیسے کہ مجھے تم میں سے سب سے معمولی آدمی پر فضیلت حاصل ہے"،[4]

تحصیل علم کی فضیلت میں ارشاد ہے :۔

"جس شخص نے ایک راستہ علم کی طلب میں طے کیا، وہ جنت کے راستوں میں سے ایک

---

[1] احیاء العلوم جلد ۱ ص ۴، و تذکرۃ السامع ص ۵ و ۶، [2] تعلیم المتعلم ص ۷، [3] صحیح بخاری کتاب العلم جلد ۱ ص ۱۶
[4] ترمذی ص ۳۲۵،

راستہ پر چلا۔"

امام غزالی اور ابن عبد البر نے چند اور حدیثیں علم کی طلب کی فضیلت میں لکھی ہیں، جن میں بعض بہت مشہور ہیں، جیسے طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم اور بہ روایت "علی کل مسلم و مسلمۃ" یعنی علم کی طلب ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے، اسی طرح ارشاد ہے، :-

"علم خزانے ہیں اور اون کی کنجی سوال ہے"،

فرمایا :-

"جاہل کو سزاوار نہیں کہ اپنی جہالت پر خاموش (قانع) رہے، اور نہ عالم کو سزاوار ہے، کہ وہ اپنے علم کے باوجود خاموش رہے"،

حضرت ابو ذرؓ سے مروی ہے، کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا :-

"ایک عالم کی مجلس کی حاضری ایک ہزار رکعت نمازوں، ایک ہزار مریضوں کی عبادت اور ایک ہزار جنازوں کی شرکت سے افضل ہے"،

اس پر پوچھا گیا، کہ اور "قرآن مجید کی تلاوت سے"، تو آپ نے فرمایا، :-

"کیا قرآن علم کے بغیر نفع پہونچا سکتا ہے، ؟"

آپ نے فرمایا :-

"اگر کسی ایسے شخص کو موت آئی، جو ایسے علم کی طلب میں تھا، جس سے اسلام کو زندگی عطا ہو تو اسکے اور رسولوں کے درمیان صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا"،

حضرت معاذؓ کو یمن بھیجتے وقت آپ نے ان سے فرمایا، :-

"اگر تمھارے ذریعہ سے ایک شخص نے ہدایت پائی تو یہ تمھارے لئے دنیا و مافیہا سے بہتر ہے"،

۱؎ بخاری جلد ۱ ص ۱۶ و ترمذی،

آپ نے فرمایا:۔

"جس نے علم کا ایک باب اس لئے پڑھا کہ لوگوں کو تعلیم دے تو اسے ستر صدیقین کا ثواب عطا ہوا"

ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا:۔

"کیا ہی عمدہ عطیہ اور عمدہ ہدیہ ہے حکمت کا ایک وہ کلمہ جسے تم نے سنا اور محفوظ رکھا پھر اسے اپنے بھائی تک پہونچایا، اسکا سکھانا مسنون عبادت کے برابر ہے"

آپ نے ایک مرتبہ فرمایا:۔

"میرے جانشینوں پر خدا کی رحمت ہو"

سوال کیا گیا کہ آپ کے جانشین کون ہیں؟ تو ارشاد ہوا:

"وہ لوگ جو میری سنت کو زندہ کریں گے، اور اللہ کے بندوں کو اسکی تعلیم دیں گے"[1]

آپ نے فرمایا:۔

"بندہ دین میں فہم حاصل کرنے سے زیادہ کسی دوسری چیز کی وجہ سے افضل نہیں، ایک فقیہ ہزار عابدوں سے زیادہ شیطان کے لئے سخت ہوتا ہے"[2]

نیز فرمایا:۔

"قیامت کے دن تین گروہوں کے لوگ شفاعت کریں گے، انبیا، پھر علما، پھر شہداء"

اسی طرح روایت ہے:۔

"جس نے ایک عالم کی عزت کی، اوس نے ستر نبیوں کی عزت کی، اور جس نے ایک طالب علم

---

[1] احیاء العلوم جلد ا ص ۶، ۷، ومختصر جامع بیان العلم ص ۹ تا ۲۲، [2] ترمذی ص ۳۲۴، وابن ماجہ ص ۲۰،

کی عزت کی، اس نے ستر شہیدوں کی توقیر کی"

ایک روایت میں ہے:-

"جس نے عالم کے پیچھے نماز پڑھی، اوس نے نبی کے پیچھے نماز پڑھی، اور جس نے نبی کے پیچھے نماز پڑھی اسے مغفرت حاصل ہوئی"[۱]

علماء کی شان میں سب سے مشہور حدیث یہ ہے:-

العلماء ورثۃ الانبیاء، علماء انبیاء کے وارث ہیں،

علامہ ابن حجر اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں، کہ اسے ابوداؤد، ترمذی، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے، اور امام بخاری نے ترجمہ باب میں اسے جگہ دیکر اسکی صحت تسلیم کرلی ہے، اور اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے:-

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا[۲] — پھر ہم نے کتاب ان لوگوں کے درمیان وراثت چھوڑی جنھیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چُن لیا ہے،

نیز امام بخاری نے اس حدیث کو اپنی دوسری کتاب تاریخ کبیر میں متعدد سندوں سے نقل کیا ہے،

اور ابوداؤد اور ابن ماجہ میں اسی مفہوم کی ایک دوسری روایت موجود ہے[۳]،

علم اور تحصیلِ علم کی فضیلت میں صحابہ اور تابعین و علمائے اسلام کے آثار و اقوال

علم اور علماء کی فضیلت میں صحابہ، تابعین، اور علمائے اسلام کے بہ کثرت آثار واقوال مروی ہیں، حضرت معاذ بن جبل رضی تحصیلِ علم کی تلقین کرتے ہوئے

---

[۱] یہ حدیثیں ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں، امام غزالی نے احیاء العلوم میں اور قاضی ابن جماعہ نے تذکرۃ السامع میں نقل کی ہیں، اور ان میں سے اکثر کنز العمال جلد ۵ ص ۲۰۴ کتاب العلم میں موجود ہیں، [۲] فتح الباری جلد ۱ ص ۸۳
[۳] حاشیہ تذکرۃ السامع ص ،

فرماتے ہیں ،:۔

"علم سکھاؤ اس لئے کہ علم کا سکھانا نیکی ہے ، اور اس کا طلب کرنا عبادت ہے ، اور اس کا مذاکرہ کرنا تسبیح اور اس پر بحث کرنا جہاد ، اس کا خرچ کرنا تقرب الٰہی کا ذریعہ اور نہ جاننے والے کو بتانا صدقۂ جاریہ ہے[1]"

حضرت ابو ذرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے ، :۔

علم کا ایک باب جو ہم پڑھتے ہیں ، وہ میرے نزدیک نفل کی ایک ہزار رکعتوں سے زیادہ پسندیدہ ہے ، اور علم کے ایسے باب کا پڑھنا جس پر ہم عمل بھی نہ کرسکیں ؟ تو وہ بھی سو رکعتوں کے پڑھنے سے بہتر ہے"

حضرت ابن عمرؓ کا ارشاد ہے کہ

"فقہ کی ایک مجلس ساٹھ سال کی عبادت سے زیادہ فضیلت رکھتی ہے[2]"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت کمیلؓ سے فرمایا :۔

"اے کمیل ! علم دولت سے بہتر ہے ، علم پاسبانی کرتا ہے ، اور دولت کی پاسبانی تمھیں کرنی پڑتی ہے ، اور علم حکمراں ہوتا ہے ، اور دولت پر حکمرانی کیجاتی ، اور دولت خرچ ہونے سے کم ہوتی ہے ، اور علم خرچ کرنے سے زیادہ ہوتا ہے"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے یہ اثر بھی منقول ہے کہ

"عالم روزہ دار زاہد اور مجاہد سے افضل ہے ، جب کوئی عالم وفات پاتا ہے ، تو اسلام میں ایک روزن ہوجاتا ہے جو اسکے قائم مقام کے آنے کے بعد بند ہوتا ہے"

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ

---

[1] ابو داؤد جلد ۲ ص ۷۷ ، و ابن ماجہ ص ۱۷ ، [2] دارقطنی و کنز العمال جلد ۵ ص ۲۰۸

"حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کو علم، دولت، اور سلطنت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا، انھوں نے علم کو منتخب کیا، تو دولت وسلطنت بھی اس کے دامن سے وابستہ ہاتھ آئی"،

فتح موصلیؒ سے منقول ہے کہ انھوں نے لوگوں سے پوچھا کہ اگر مریض کھانے پینے اور دوا کھانے سے روک دیا جائے تو وہ مر نہ جائے گا؟ لوگوں نے اثبات میں جواب دیا تو انھوں نے فرمایا:

"یہی قلب کا حال ہے، اگر اسے تین دن علم وحکمت سے روک دیا جائے، تو وہ مردہ ہو جائیگا"

زبیر بن ابوبکر کہتے ہیں، کہ ان کے والد نے انھیں یہ نصیحت لکھ بھیجی کہ

"لازم ہے کہ تم علم کی طلب کرو، کیونکہ اگر تم فقیر ہو گئے، تو علم تمہاری دولت ہو گا، اور اگر تم مالدار ہوئے تو علم تمہارا حسن وجمال بنے گا"

ابن مبارک فرماتے ہیں:۔

"مجھے اس شخص پر تعجب آتا ہے، جو علم حاصل نہیں کرتا، اس کے باوجود اپنے کو عزت کیئے جانے کا مستحق سمجھتا ہے"

حضرت ابودرداؓ فرماتے ہیں:۔

"اگر میں ایک مسئلہ کی تعلیم حاصل کروں تو یہ میرے نزدیک رات بھر نماز پڑھنے سے بہتر ہے"

حضرت عطاءؒ فرماتے ہیں:۔

"علم کی ایک مجلس لہو ولعب کی ستر مجلسوں کا کفارہ ادا کرتی ہے،

امام شافعی نے فرمایا:۔

"علم کی تحصیل نفل پڑھنے سے افضل ہے"،

ابن عبدالحکمؒ کا بیان ہے، کہ وہ امام مالک کے پاس تعلیم حاصل کرنے میں مشغول تھے، جب ظہر کی نماز کا وقت آیا، تو انھوں نے نماز میں جانے کے لئے اپنی کتابیں سمیٹیں، اس وقت امام مالک نے فرمایا:

"جس چیز کے لئے تم جس چیز کو چھوڑ کر اٹھ رہے ہو، وہ اس سے افضل نہیں، اگر علم کی تحصیل کی نیت درست ہے"۔[1]

حضرت ابن عباس رضی نے فرمایا:۔

"انسانوں کو خیر کی تعلیم دینے والے کے لئے ہر چیز دعا کرتی ہے، یہاں تک کہ مچھلی بھی سمندر میں دعا گوئی میں مصروف رہتی ہے"۔

بعض بزرگوں کا قول ہے:۔

"علما، زمانوں کے چراغ ہیں، ان میں سے ہر عالم اپنے اپنے زمانہ کے لئے روشنی ہے جس سے اسکے زمانہ کے لوگ روشنی حاصل کرتے ہیں"۔

حضرت عکرمہ سے مروی ہے، کہ انھوں نے ایک مرتبہ کہا کہ علم کی قیمت ہوتی ہے، پوچھا گیا وہ کیا ہے تو فرمایا:۔

"اسے اس شخص کو دو، جو اسے عمدہ طریقہ سے اٹھائے اور ضائع نہ کرے"۔[1]

سفیان بن عیینہ کہتے ہیں:۔

"اللہ کے نزدیک عزت میں سب سے بڑھے ہوئے وہ ہیں، جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہیں، اور وہ انبیا، اور علما، ہیں"۔

نیز انھوں نے فرمایا،

"نبوت سے زیادہ افضل کوئی چیز نہیں، اور نبوت کے بعد علم کا درجہ ہے"۔

سہل کہتے ہیں:۔

"جو انبیاء کی مجلسیں دیکھنے کی آرزو رکھتا ہو، وہ علماء کی مجلسوں میں بیٹھے، ان کی مجلسیں انبیاً

---

[1] احیاء العلوم جلد ا ص ۵ تا ۵۲ ایضاً

کی مجالس کا نمونہ ہیں"

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:۔

"اگر با عمل علماء، اللہ کے اولیا نہیں تو پھر اللہ کا کوئی ولی نہیں ہے"

امام سفیان ثوری اور امام شافعی سے منقول ہے، کہ

فرائض کی ادائی کے بعد علم کی طلب سے زیادہ افضل کوئی چیز نہیں"

قاضی ابن جماعہ ان آثار و اقوال کو نقل کر کے لکھتے ہیں، کہ ان سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے علم میں مشغول رہنا نفل کی بدنی عبادتوں نماز، روزہ، تسبیح اور دعا وغیرہ سے بہتر ہے، کیونکہ اس کے علم کا نفع اس شخص کو حاصل ہونے کے علاوہ دوسرے لوگوں تک بھی پہونچے گا، اور جسمانی عبادتوں، نفل نمازوں اور وظیفوں وغیرہ کا نفع صرف اسکی ذات تک محدود رہے گا، بلکہ عالم کے علم سے اس کی وفات کے بعد بھی نفع پہونچنا ممکن ہے، اور علامہ ابن عبدالبر نے اس موقع پر اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے، کہ مرنے کے بعد سب کے عمل کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے" سوائے تین قسم کی چیزوں کے" ایک صدقہ جاریہ، دوسرے ایسا علم جس سے اس کے مرنے کے بعد بھی نفع ہو، اور تیسرے صالح لڑکے جو اس کے حق میں بھلائی کی دعا کریں، لیکن عابد کی عبادت سے صرف اسکی ذات کو نفع پہونچتا ہے۔[۱]

اس بزرگی اور بڑائی کا مصداق بننے کے لئے بعض شرطیں،

لیکن اسلام نے علم کی ان بزرگیوں اور عزتوں سے صرف ان علماء کو مشرف کیا ہے جو علم کے ساتھ اپنے دامن میں عمل کا ذخیرہ بھی رکھتے ہوں، چنانچہ قاضی ابن جماعہ علم اور علم والوں کی فضیلتیں بیان کرنے کے بعد علم حاصل کرنے والے کیلئے ذیل کی شرطیں لکھتے ہیں:

۱۔ علم اور علماء کی یہ فضیلتیں صرف ان لوگوں کے لئے ہیں، جو علم کیساتھ عمل کے زیور سے بھی آراستہ ہوں اور ان کے علم حاصل کرنے کا حقیقی مقصد اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنا ہو۔

---

[۱] تذکرۃ السامع ص ۱۳ و مختصر جامع بیان العلم ص ۱۴

۲۔ علم کی طلب کسی بری نیت سے نہ ہو،

۳۔ علم کی طلب میں دنیاوی غرضیں، جاہ، منزلت، دولت، ثروت، ناموری اور پیشوا بننے کی ہوس شامل نہ ہو، کیونکہ اسلام میں علم کے جہاں وہ فضائل گنائے گئے ہیں، اسی کیساتھ بری خواہشوں اور دنیاوی غرضوں سے بچنے کی سخت تاکید کی ہے۔[1] ترمذی کی روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا:۔

"جو شخص علم اس غرض سے حاصل کرے کہ وہ اسکے ذریعہ سے بیوقوفوں سے بحث ومباحثہ کرے یا اسکی طرف لوگ عقیدت سے جھکیں، تو اللہ اس شخص کو دوزخ میں داخل کریگا"[2]

دوسرے لفظوں میں ارشادِ نبوی ہے:۔

"جس شخص نے علم خدا کے سوا کسی دوسرے کے لئے حاصل کیا، اور خدا کے علاوہ اس کی طلب میں کوئی دوسری غرض شامل رہی ہو، تو خدا جہنم میں اس کا ٹھکانا بنائے گا"[3]

اسی طرح آپ نے فرمایا:۔

"جس نے اس علم کو جس سے اللہ کی مرضی حاصل کیجاتی ہے، اسلئے حاصل کیا کہ اس سے اپنی کوئی (دنیوی) غرض حاصل کرے تو وہ قیامت کے دن جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا"[4]

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا،

پہلا شخص جسکا قیامت کے دن فیصلہ کیا جائے گا (اور راوی نے تینوں شخصوں کا ذکر کیا اور انمیں) وہ شخص ہے جس نے علم سیکھا اور اسکو سکھایا اور قرآن پڑھا، تو اسکو لایا جائیگا اور خدا اس پر اپنے احسانات جتائیگا اور وہ انکو تسلیم کریگا، پھر خدا کہے گا کہ تونے اس سے کیا کام لیا وہ کہے گا کہ میں نے تیری لئے علم سیکھا اور سکھایا، تیری لئے قرآن پڑھا، خدا کہے گا کہ تو جھوٹ کہتا ہے تونے اسلئے علم سیکھا کہ یہ کہا جائے کہ تو عالم ہے، اور تونے قرآن اسلئے پڑھا کہ یہ کہا جائے کہ تو قاری ہے، پھر اسکے متعلق حکم دیا جائیگا اور وہ منہ کے بل گھسیٹتا ہوا لایا جائے گا، یہاں تک کہ آگ میں ڈال دیا جائے گا،[5] (باقی)

[1] تذکرۃ السامع ص ۱۳، [2] ترمذی ص ۴۲۱، [3] ابوداؤد جلد ۲ ص ۲۸، [4] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۴۰

The J & K University Library
Acc. No. 19049

اخلاق وسیرت کی تربیت

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اسلام کے تعلیمی نصب العین کی تکمیل کے لئے یہ ضروری تھا کہ طالب علموں میں نیک سیرت اور عمدہ اخلاق پیدا کئے جائیں، چنانچہ مشہور علمار کے ایسے بہت سے اقوال ہیں، جن میں طلبہ کو بلند اخلاق کے حصول کی تلقین کی گئی ہے، ابومرزوق حبیب بن شہید متوفی ۱۰۹ھ اپنے صاحبزادے سے فرماتے ہیں :۔

"بیٹا (حصول علم کیساتھ) عالموں اور فقیہوں کی صحبت اختیار کرو، ان سے تعلیم حاصل کرو، تہذیب و شائستگی سیکھو، یہ میرے نزدیک زیادہ باتیں بنانے سے بہتر ہے"،

ابن سیرین فرماتے ہیں :۔

لوگ جیسے علم حاصل کرتے تھے، ویسے ہی سیرت اور اخلاق بھی حاصل کرتے تھے"،

سفیان بن عیینہ کا ارشاد ہے :۔

آنحضرت صلعم سب سے بڑی ترازو ہیں، چیزیں آپ ہی کے خلق اور سیرت پر تولی جائیں، جو چیزیں آپ کے مطابق نکلیں، وہ حق ہیں، اور جو آپ سے مخالف ہوں وہ باطل ہیں،

بعض بزرگوں کا قول ہے کہ

"تہذیب اور حسن ادب کا ایک باب پڑھنا علم کے ستر بابوں کے پڑھنے سے زیادہ بہتر ہے"،

حضرت مخلد بن حسین ابن مبارک سے فرماتے ہیں :۔

"ہم لوگ حدیثیں زیادہ حاصل کرنیکے بجائے حسن ادب کے زیادہ حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں"[1]

[1] تذکرۃ السامع از ص ۲ تا ۱۴،

طلبہ کو اسلام کے تعلیمی نصب العین کی تلقین

اہل علم و اساتذہ طالب علموں کو اسلام کی ان تعلیموں کے مطابق انھیں اپنا تعلیمی نصب العین مقرر کرنے کی ہدایت کرتے تھے چنانچہ قاضی ابن جماعہ نے اُسے استادوں کے فرائض میں شمار کیا ہے، کہ وہ طلبہ کو اپنے قول و عمل سے حسن نیت اور اخلاصِ عمل اختیار کرنے کی تلقین کرتے رہیں، انھیں علم کی فضیلتیں بتائیں، اور اچھے مستقبل کی امید دلائیں، اور ان کے سامنے ان کے علم حاصل کرنے کا مقصد بیان کریں کہ

"وہ اپنی تعلیم اور تہذیب کا مقصد اللہ تعالیٰ کی مرضی حاصل کرنا، علم کی اشاعت کرنا، شریعت کو قائم کرنا، حق بات زبان سے نکالنا، اور ناحق باتوں کو روکنا قرار دیں،..... (ورنہ) اگر نیک نیتی سے علم حاصل نہیں کیا گیا، تو اس علم سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں، کیونکہ حسنِ نیت ہی سے علم میں برکت حاصل ہونے کی امید کیجاتی ہے"

پھر دوسرے موقع پر طالب علموں سے کہتے ہیں کہ

"طلبہ کو چاہئے کہ وہ اپنے دل کو ہر قسم کی کھوٹ کپٹ، عداوت، کینہ، بدخلقی، اور بدعقیدگی سے پاک رکھیں، تاکہ اس میں علم کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو، اس کی باریکیاں دل میں اتر سکیں، جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا علم باطن کی نماز اور دل کی عبادت ہے، اس لئے جس طرح ظاہر کی عبادت، طہارت کے بغیر قبول نہیں اسیطرح باطنی عبادت بھی دل کی پاکی کے بغیر درست نہ ہوگی، حدیث میں آیا ہے، کہ "جسم میں ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ درست ہے، تو جسم بھی تندرست ہے، اور اگر اس میں خرابی آئی، تو سارا جسم میں خراب ہوگیا، آگاہ رہو، کہ وہ دل ہے"

(بخاری کتاب الایمان جلد ا ص ۱۳)

سہل کہتے ہیں "قلب میں اس وقت تک روشنی نہیں پہونچ سکتی جب تک اس میں کوئی ایسی چیز موجود ہو جو خدا کو پسند نہیں ہے"

اس کے بعد قاضی ابن جماعہ طالب علموں کے حُسنِ نیت اور اخلاص کے متعلق لکھتے ہیں:-

"پھر طالب علم کے لئے علم کی طلب میں دوسری شرط اسکی نیت کا خالص ہونا ہے، اس سے یہ یقین رکھنا چاہیئے، کہ علم کے حاصل کرنے کا مقصد خداوند تعالیٰ کی خوشنودی کی جستجو اس کے حکموں پر عمل شریعت کو زندہ، دل کو روشن اور باطن کو اجاگر کرنا ہے"[1]۔

اسی طرح زرنوجی کہتے ہیں :۔

"طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ تحصیل علم سے رضائے الٰہی، اور دار آخرت کی طلب جہل کے ازالہ احیائے دین، اور ابقائے اسلام کی نیت رکھے"[2]۔

امام سفیان ثوری فرماتے ہیں :۔

"میں نے اپنی نیت سے زیادہ کسی دوسری چیز کی نگرانی نہیں کی، کہ علم کی تحصیل کی غرض میں دنیاوی اغراض، جاہ و منزلت کی خواہش، دولت و ثروت کی ہوس، ہمعصروں اور دوستوں میں سربلندی کی تمنا، لوگوں کی نگاہوں میں عظمت حاصل کرنے کی آرزو، اور مجلسوں میں ہاتھوں ہاتھ لئے جانے کا خیال شامل نہ ہو جائے، کیونکہ اگر ایسا ہوا تو عمدہ چیز کے بدلہ میں معمولی چیز ملیگی"۔

قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں :۔

لوگو! اپنے علم سے صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حاصل کرنے کی نیت رکھو، میں جب کبھی کسی مجلس میں اس نیت سے بیٹھا، کہ خاکسار اور متواضع رہونگا، تو ہمیشہ اس مجلس سے سربلند ہو کر اٹھا، اور جب کبھی میری نیت میں فتور آیا، اور ہم چشموں میں سربلند ہونے کا تصور دل میں آیا تو مجھے اس مجلس سے رسوا ہو کر اٹھنا پڑا، علم بھی عبادتوں میں سے ایک عبادت ہے"[3]۔

نصب العین کی بلندی سے نظر کی بلندی۔ اسلام کے اس بلند تعلیمی نصب العین کا یہ اثر تھا کہ اس دور کے اہل علم

---

[1] تذکرۃ السامع ص ۴۸، ۴۹، ۶۸، ۶۹، امام غزالی نے احیاء العلوم جلد ا کتاب العلم میں اسے زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔
[2] تعلیم المتعلم ص ۱۴، [3] تذکرۃ السامع ص ۶۸، ۶۹۔

نے بڑی بلند نظر پائی تھی، اور اپنی زندگی بڑے استغنا اور قناعت سے گذارتے تھے اور اپنے علم کی عزت خود کرتے تھے، وزیر جعفر برمکی عیسیٰ بن یونس مقری کے متعلق کہتا ہے:۔

"مین نے قاریوں میں عیسیٰ بن یونس کے مثل کسی کو نہین دیکھا، ان کے سامنے ایک لاکھ درہم پیش کئے گئے، لیکن انھون نے یہ کہکر واپس کر دیئے، کہ خدا کی قسم اہل علم یہ کہہ سکین، کہ مین نے سنت کی اشاعت کرنے کی قیمت کھائی ہے"،

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر مامون نے دس ہزار ان کی خدمت میں پیش کئے، لیکن انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا[1]،

سفیان بن عیینہ کا بیان ہے، کہ

"مجھے قرآن کا فہم عطا کیا گیا تھا، لیکن جب مین نے ابو جعفر (المنصور متوفی ۱۵۸ھ) سے تھیلی لے لی، تو وہ فہم مجھ سے چھین لیا گیا، ہم اللہ سے مسامحت پر عفو چاہتے ہین"[2]

بعض شبہات کا ازالہ اور اسلام میں دیگر علوم کی اہمیت

اسلام کے اس تعلیمی نصب العین سے یہ شبہہ نہ ہو، کہ اسلام نے دوسرے دنیاوی علوم جن کی تمدنی زندگی میں ضرورت پڑتی، اور جن پر انسانی معاشرت، عمرانی ضرورت اور جسمانی آسایش کا مدار ہے، ان کی کوئی اہمیت نہیں دی ہے، جیسا کہ ڈاکٹر دانیال ہانے بیرک اپنے خطبہ میں کہتے ہین، کہ

"آٹھوین صدی (دوسری صدی ہجری) میں اسلامی دنیا کے ایک سربرآوردہ عالم کا ذکر ہے، کہ اس نے بڑے تذبذب کیساتھ اس بات کا اعتراف کیا کہ فقہ کے علاوہ جس کی بنیاد قرآن کریم پر ہے، اور جو روحانی صحت کا باعث ہے، طب بھی علم کی ایک شاخ ہے جس سے جسمانی صحت قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے، ان کے علاوہ اس نے باقی سب علوم کو تفنن طبع کا سامان قرار دیا"،

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ا ص۲۵۸ [2] تذکرۃ الحفاظ،

یہ شبہہ اسلام کے اسی بلند نصب العین کی غلط تاویل سے پیدا ہوا ہے، درحقیقت اسلام کے اس بلند نصب العین کا تعلق علم اور تعلیم کے مقصدِ اعلیٰ سے ہے، ورنہ اس نے نہ صرف ہیں دنیاوی، عمرانی، اجتماعی، اور معاشرتی ضرورتوں کے لئے دوسرے علموں کے حاصل کرنے کی اجازت دی، بلکہ بعض موقعوں پر ہمت افزائی کی ہے، اور ان کے تعلیم و تعلم میں دینی حیثیت سے کسی قسم کی مداخلت روا نہیں رکھی ہے، ارشاد نبوی ہے:

اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ، تم اپنے دنیاوی امور کے زیادہ جاننے والے ہو

وعید کی ان حدیثوں میں بھی جن میں علم کی تحصیل میں دنیاوی غرض کے وابستہ کرنے کی مذمت کی گئی ہے، یہ نکتہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ مومن کی ہر حرکت و جنبش خداوند تعالیٰ کی خوشنودی ہی کے ماتحت رکھی گئی ہے اور ہر کام میں اصل مدار انسانوں کی نیتوں پر رکھا گیا ہے، اسلئے اگر کسی دنیوی سے دنیوی علم کی تحصیل بھی مثلاً مخلوقِ خدا کو فائدہ اور شہر اور وطن کے لوگوں کو آرام پہنچانے اور اہل و عیال کی پرورش کرنے کے لئے اس نیت سے کی جائے، کہ ان کے حقوق ادا کرکے اور انھیں فائدہ پہونچا کر حکم خداوندی بجالانے کی توفیق حاصل ہوگی، تو بارگاہِ الٰہی سے اُسے مقبولیت کی سند عطا ہوگی، اور وہ آخرت میں اجر پانے کا مستحق ہوگا، احادیث میں اس مفہوم کی مختلف روایتیں ہیں، مثلاً اگر کسی شخص نے اپنے بچہ کے منہ میں ایک لقمہ بھی اس نیت سے ڈالا کہ حکم خداوندی پورا ہوگا، تو اللہ تعالیٰ اس کی نیت کا اجر اسے عطا فرمائے گا، ایک حدیث میں ہے کہ "بہت سے ایسے عمل جو دنیاوی معلوم ہوتے ہیں، وہ حُسن نیت سے اُخروی اعمال بن جاتے ہیں، اور بہت سے عمل جو دینی نظر آتے ہیں، وہ نیت کی برائی سے دنیاوی بن جاتے ہیں"۔

علاوہ ازیں وعید کی ان حدیثوں میں سے ابو داؤد میں جو حدیث مروی ہے اس کے متن کے الفاظ یہ ہیں:۔

مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا مِمَّا یَنْبَغِیْ بِہٖ جس نے اس علم کو جس سے اللہ کی

وجہ اللہ تعالیٰ لایتعلمہ الا — مرضی حاصل کیجاتی ہے، اسلئے حاصل کیا کہ اپنی
لیصیب بہ غرضاً من الدنیا لم — کوئی دنیوی غرض حاصل کرے، تو وہ قیامت
یجد عرف الجنۃ یوم القیامۃ۔ — کے دن جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا،

اس سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے، کہ یہ تمام وعیدیں ان لوگوں کے لئے ہیں جو اشرف علوم یعنی علم دین کی تحصیل میں مصروف ہوں، اور اس سے ان کی کوئی دنیاوی غرض وابستہ ہو، اسلئے معلوم یہ ہوا کہ صرف علم دین کا کسی دنیاوی غرض سے حاصل کرنا اسلام کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہے، ورنہ جہانتک دوسرے دنیاوی علموں کا تعلق ہے، بعض اوقات علما نے ان کی تحصیل مسلمانوں پر فرض کفایہ کے طور پر عائد کی ہے امام غزالی نے احیاء العلوم میں یہ نکات تفصیل سے دکھائے ہیں، چنانچہ حدیث نبوی طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم اور اطلبوا العلم ولو کان بالصین پیش کرکے جس علم کی تحصیل ہر مسلم پر فرض ہے، اسکو دکھا کر "اس علم کا بیان جس کی تحصیل فرض کفایہ ہے" کے عنوان سے لکھتے ہیں:۔

"علوم کی اولاً دو قسمیں ہیں، (۱) علوم شرعیہ و (۲) علوم غیر شرعیہ،

علوم شرعیہ سے میری مراد وہ علوم ہیں جو انبیاء کرام علیہم الصلوات سے براہ راست حاصل ہوتے ہیں، ان کی طرف عقل کی رہنمائی اس طریقہ سے نہیں ہو سکتی، جیسے عقل کے ذریعہ علم حساب سیکھا جاتا ہے، نہ وہ تجربہ سے حاصل ہو سکتے ہیں، جیسے علم طب کی تدوین ہوتی ہے، اور نہ محض سننے سے انکا حاصل کرنا ممکن ہے، جیسے علم لغت حاصل کیا جاتا ہے،

اسکے بعد جو علوم غیر شرعیہ ہیں، ان میں بعض پسندیدہ ہیں، اور بعض ناپسندیدہ، اور بعض ایسے جو صرف درجۂ مباح رکھتے ہیں،

۱۔ علوم پسندیدہ وہ ہیں جن سے دنیاوی امور کی مصلحتیں وابستہ ہوتی ہیں، جیسے علم طب اور حساب وغیرہ، پھر ان علوم پسندیدہ میں اپنے درجوں کے لحاظ سے بعض ایسے ہیں جنکا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے، بعض ایسے ہیں جنھیں

حاصل کرنا افضل ہو، اور بعض ایسے ہیں، جنکو حاصل کیا جاسکتا ہے، مگر ان کی تحصیل فرض نہیں ہے،

پھر ان میں سے فرض کفایہ ہر وہ علم ہو، جس سے ہم دنیاوی زندگی اور کاروبار کے قائم اور باقی رکھنے میں بے پروا نہیں ہو سکتے، جیسے علم طب ہے، کہ اس کی تحصیل صحت کے باقی رکھنے کے لئے لازمی ہے، یا علم حساب ہے کہ مختلف معاملوں وصیتوں اور ترکہ کی تقسیم میں اسکی ضرورت ہوتی ہے، اگر کوئی شہر ان علموں کے جاننے والوں سے خالی ہو جائے، تو شہر والوں کو دقت پیش آئے گی اور جب کوئی ایک شخص بھی ان کا جاننے والا ان کے درمیان پیدا ہو جائے تو اس کے ذریعہ سے شہر کی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں، اس لئے یہ فرض اس کی موجودگی میں دوسروں کو ذمہ سے ساقط ہو جائے گا، اسی طرح مختلف پیشے کاشتکاری، باغبانی، پارچہ بافی، سیاسی حجامت اور خیاطی وغیرہ ہیں، کہ اگر ان میں سے کسی پیشہ والے سے کوئی شہر خالی ہو جائے، تو زحمت پیش آئے، اور بعض پیشہ والوں کی عدم موجودگی میں ہلاکت تک کی نوبت آجائے، پس جس نے بیماری اتاری، اس نے دوا بھی بتائی، اور ان کے استعمال کے طریقے بتائے، اور ان کے مہیا کرنے کے اسباب پیدا کئے، اس لئے ان پیشوں کو چھوڑنا جائز نہ ہوگا

اور بعض علوم جن کا حاصل کرنا اگرچہ فرض نہیں، مگر افضل ہے، وہ جیسے علم حساب و طب میں باریکیاں پیدا کرنا ہو، کہ انسان ان سے مستغنی ہو سکتا ہے لیکن ان کی تحصیل سے فائدہ پہونچنے کے پہلوؤں میں اضافہ ہوتا ہے،

ناپسندیدہ علوم میں سحر، شعبدہ بازی، اور نظر بندی وغیرہ ہیں، اور علم مباح میں جیسے ایسے اشعار کا پڑھنا، جن میں رکاکت نہ ہو یا علم تاریخ وغیرہ سے دلچسپی رکھنا ہے"[1]

پھر امام غزالی نے بھی ایک دوسرے موقع پر بھی "علم" کے مصداق میں مختلف علموں اور پیشوں کو داخل

[1] احیاء العلوم جلد ۱،

کیا ہے ان کے بیان کا خلاصہ حسب ذیل ہے، کہتے ہین،:-

"جب علم تمام امور میں افضل ہی تو اس کا حاصل کرنا افضل چیز کا حاصل کرنا ہے، اور اس کی تعلیم دینا افضل چیز کا مہیا کرنا ہے، اور اس کی تفصیل یہ ہے، کہ انسان کی پیدایش کے مقاصد دین اور دنیا دونون کے مجموعہ پر مشتمل ہیں، کیونکہ دین کا نظام جبتک دنیاوی نظام قائم نہ ہو، قائم نہین ہوسکتا، اور امر دنیاوی کا انتظام انسانوں کے کاموں اور پیشوں پر موقوف ہے، اور انسانی پیشے تین قسم کے ہین،

ایسے پیشے جو عالم کے قیام کے لئے بنیاد کے طور پر ہین، اور وہ چار ہیں، زراعت[۱] انسان کی غذا لئے، پارچہ بافی[۲] تن پوشی کے لئے، تعمیر[۳] سکونت کی جگہ کے لئے اور سیاست[۴] خاندان اور ملک کے انتظام اور معیشت کے اسباب کے مہیا کرنے اور اسکی حفاظت کرنے کے لئے،

۲- دوسرے وہ پیشے جو ان چارون پیشوں کے لئے آلات اور وسیلے مہیا کرین، جیسے لوہاری اور ندافی (دھنائی) وغیرہ،

۳- تیسرے وہ پیشے ہیں، جو پہلی قسم کے پیشوں کو مدد پہونچائیں، جیسے کھانا پکانے، اور سینے پرونے وغیرہ کے پیشے،

ان سب پیشوں میں پہلی قسم کے پیشوں کو فضیلت حاصل ہے، اور ان میں سے بھی سب سے افضل سیاست کا پیشہ ہی جس سے نظم اور ضبط کا وجود عمل میں آتا ہے، اور اس کے ذریعہ سے مخلوق کی اصلاح کیجاتی ہی، اور انھین حق کی راہ دکھائی جاتی ہے،

پیشۂ سیاست کے چار درجے قرار پا سکتے ہیں،

۱- پہلے درجہ میں انبیاے کرام کی سیاست ہے، جو وہ اپنے پیغاموں سے خلق کی رہبری فرماتے ہین،

۲۔ دوسرا درجہ خلفاء اور سلاطین کو حاصل ہے، ان کے احکام عوام وخواص پر نظم وانتظام کے لئے جاری ہوتے ہیں، لیکن ان کی حکومت ظاہر پر ہوتی ہے باطن پر نہیں،

۳۔ تیسرے علمائے کرام ہیں، یہ انبیائے کرام کے وارث ہیں، ان کی حکومت لوگوں کے دلوں پر ہوتی ہے، اور یہ باطن کی اصلاح کرتے ہیں،

۴۔ چوتھے واعظ ہیں جو صرف عوام کی اصلاح کرتے ہیں،

پس ان پیشوں میں سب سے بڑھ کر پیشہ نبوت کے بعد علم کا فائدہ پہونچانا اور لوگوں کو تہذیب اور اخلاق سکھانا ہے، اور یہی فن تعلیم کا حقیقی مقصود ہے[1]"

اس کے ساتھ اسلامی نقطۂ نظر سے علم دین کے حاصل کرنے والوں کے لئے یہ بھی جائز نہ تھا کہ وہ اس علم کی فضیلت پر ناز کرکے دوسرے غیر شرعی علوم کو حقارت کی نظر سے دیکھیں، کیونکہ دنیاوی زندگی میں ان علوم کی ضرورتیں مسلّم تھیں، امام غزالی نے اس بحث پر اس لحاظ سے بھی گفتگو کی ہے، اور نتیجہ کے طور پر دکھایا ہے، کہ علم دین حاصل کرنے والوں کی مثال ان مجاہدوں سے دیجاسکتی ہے، جو جہاد کے میدان میں اپنا سر ہتھیلی پر لئے دین کی حمایت میں لڑ رہے ہیں، اور دوسرے علوم کے حاصل کرنے والوں کی مثال فوج کے اس دستہ سے دیجائیگی، جو سرحدی قلعوں پر سرحد کی حفاظت کیلئے متعین ہوتا ہے[2]،

علم کی تعلیم وتحصیل انسانی فطرت میں طبعی ہے،

دوسری طرف علمائے اسلام میں سے ابن خلدون نے تعلیم وتحصیل کے فن کو تمدنی زندگی میں انسانی طبیعت کے لئے فطری قرار دیا ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"انسان تمام حیوانوں سے اپنی حیوانیت میں حس، حرکت اور غذا کے لحاظ سے مشارکت رکھتا ہے، اسے حیوانوں سے جو امتیاز حاصل ہے، وہ اس کی قوتِ فکر کی وجہ سے ہے، اس کے ذریعہ سے وہ اپنی معاش کی تحصیل اور اپنے ابنائے جنس سے اس کے حصول میں تعاون کرتا ہے، اور اس تعاون

---

[1] احیاء العلوم جلد ۱ ص ۱۰ و ۹، [2] ر جلد ا ص ۴۰،

کے مہیا کرنے کے لئے اجتماعی ہیئت اختیار کرتا ہے،

وہ اسی قوتِ فکر سے ان پیغاموں کو قبول کرتا ہے، جو انبیاے کرام اللہ تعالیٰ کی طرف سے لاتے ہیں، اور ان پر عمل کرتا ہے، اور اپنی آخرت کی بھلائی کے وسیلے اختیار کرتا ہے، وہ ان تمام معاملات میں ہر وقت غور و فکر سے کام لیتا رہتا ہے، پل بھر بھی اس سے غافل نہیں ہوتا، اور اسی غور و فکر کے ذریعہ سے علوم پیدا ہوتے ہیں، وہ اس فکر کے ذریعہ اُن ادراکات کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، جو اسے حاصل نہیں رہتے، اس لئے وہ ان لوگوں کی طرف رجوع کرتا ہے، جو اس سے پہلے علم حاصل کر چکے ہوتے ہیں، یا جن لوگوں کو اس کی معرفت زیادہ حاصل رہتی ہے، یا ان انبیاؑ کی تعلیمات میں ڈھونڈھتا ہے، جو پیشتر گذر چکے ہیں، اور ان سے انکی تعلیمات کی تلقین حاصل کرتا ہے اور ان کے حاصل کرنے اور جاننے کی کوشش کرتا ہے،

پھر اس کی فکر و نظر ایک ایک کر کے حقائق تک پہنچتی ہے، اور جو چیز اس کے سامنے آتی ہے، اسکا مطالعہ کرتا ہے، اور اس کی مشق مسلسل جاری رکھتا ہے، یہاں تک کہ اس حقیقت کے عوارض کے الحاق سے اسے ایک ملکہ حاصل ہوتا ہے، اسوقت اس حقیقت کو جو چیز پیش آتی ہے، اسکے متعلق اس کا ایک مخصوص علم بن جاتا ہے، اور آیندہ نسل اس کے حاصل کرنے کی مشتاق ہوتی ہے، اور لوگ اسکے جاننے والوں کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور اسی سے فنِ تعلیم کا آغاز ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ علم و تعلیم انسانی فطرت کے لئے طبعی ہے،[۱]

پھر ابنِ خلدون نے امام غزالی سے زیادہ واضح طریقہ سے علم و تعلیم کو منجملہ دنیاوی پیشوں کے ایک پیشہ قرار دیا ہے، اور اس نے اسے مختلف وسیع دلیلوں سے ثابت کیا ہے،[۲] اس لئے یہ سمجھنا کہ اسلام اور مسلمانوں کے تعلیمی نصب العین میں صرف مذہبی تعلیم داخل رہی ہے، صحیح نہیں ہے، بلکہ علماے اسلام نے جملہ علوم کو عقلی و نقلی

---

۱ مقدمہ ابنِ خلدون ص ۴۷۰، ۴۷۱، ۲ ۴۷۱، ۴۷۲،

دو بڑی قسموں میں تقسیم کر کے قسم اول یعنی عقلی علوم کی تحصیل انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ضروری قرار دی ہے، اور نقلی علوم کو ربانی پیغام کی تحصیل، دین و مذہب کی واقفیت اور آخرت کی بھلائی کے لئے حاصل کرنا فرض ٹھہرایا ہے، جیسا کہ امام غزالی کا بیان اوپر گذر چکا، اسی طرح ابن خلدون لکھتا ہے:-

"جن علوم پر انسان غور کرتا ہے، اور جن کی تحصیل و تعلیم شہروں میں عام طور پر کیجا سکتی ہے، اس کی دو قسمیں ہیں، ایک انسان کے لئے طبعی ہے جسے وہ اپنی قوتِ فکر سے حاصل کرتا ہے اور دوسری نقلی ہے جسے اسکے وضع کرنے والے سے حاصل کیا جاتا ہے،

قسم اوّل علوم حکمیہ فلسفیہ ہیں، یہ وہ علوم ہیں جن سے انسان اپنے غور و فکر کی طبیعت کے ذریعہ واقف ہوتا ہے اور اپنے بشری ادراک کے ذریعہ ان کے مسائل اور براہین تک پہونچتا ہے، یہانتک کہ اسکی نظر وسیع ہو جاتی ہے، اور وہ اس حیثیت سے کہ وہ صاحبِ غور و فکر انسان ہے، اس کے صواب و خطا کی تمیز کرتا ہے،

اور دوسرے وہ وضع کئے ہوئے نقلی علوم ہیں، جو واضع شرعی کی خبر کی بنیاد پر قائم ہیں، اور ان میں عقل کو دخل نہیں ہوتا، بجز اس کے کہ اس کے فروعی مسائل کو اس کے اصول سے عقل و قیاس کے ذریعہ سے ملانے کی ضرورت پڑتی ہے، کیونکہ بعد میں پیش آنے والے جزئیات نقل کلی کے ماتحت اپنی وضع کے وقت درج نہیں کئے جا سکتے، اسلئے قیاسی صورت کے الحاق کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن یہ قیاس بھی اصل میں حکم کے ثبوت کیساتھ خبر ہی سے نکلتا ہے، اس لحاظ سے یہ قیاس بھی نقل قرار پائے گا، اور ان تمام نقلی علوم کی شرعی بنیاد کتاب و سنت ہے، جو ہمارے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے مشروع کیا گیا ہے۔"[1]

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۰۷، ۴۰۶

(۲)

اسلامی نظامِ تعلیم کے تین دور

زمانہ کے اعتبار سے اسلامی نظامِ تعلیم کے تین دور قائم کئے جاسکتے ہیں :-

پہلا دور، عہدِ رسالت سے دولتِ اموّیہ کے ابتدائی زمانہ تک،

دوسرا دور عہدِ اموی سے چوتھی صدی ہجری تک،

تیسرا دور پانچویں صدی سے آٹھویں صدی ہجری تک،

ان تینوں دوروں کی امتیازی خصوصیتیں حسبِ ذیل ہیں :-

پہلا دور قرآن مجید جس طرح تمام اسلامی علوم وفنون کا سرچشمہ ہے، ویسے ہی مسلمانوں کے تعلیم وتعلم کی داستان کا آغاز بھی اسی کے نام سے ہوتا ہے، نزولِ قرآن کے ساتھ اس کی کتابت کی ضرورت پیش آئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ چند کاتبوں عبد اللہ بن سعید بن عاص رضؓ کو مسلمانوں کو فن کتابت سکھانے کے لئے مقرر فرمایا، اور بعض صحابہ حضرت ابن مکتوم رضؓ وحضرت مصعب بن عمیر رضؓ مکہ کے قیام کے زمانہ میں باشندگانِ مدینہ کو قرآن مجید پڑھانے کے لئے مدینہ بھیجے گئے[۱]، پھر مدینہ منورہ پہونچ کر آپ نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی پر توجہ رکھی، اور نوشت وخواند دونوں سلسلے قائم رہے، غزوۂ بدر کے قیدیوں میں سے جو لوگ لکھنا جانتے تھے، ان کا فدیہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا سکھانا قرار پایا[۲]، اسی طرح مسجد نبوی میں اصحابِ صفہ کا حلقۂ درس قائم کیا گیا، جس میں ایک شخص قرآن مجید پڑھتا تھا، اور حلقہ کے دوسرے حاضرین اسے توجہ سے سنتے تھے، پھر نئے مہاجرین جو دوسرے مقاموں سے آتے گئے، وہ درسِ قرآن کیلئے اسی حلقہ میں شریک کئے گئے[۳]،

---

[۱] مسند احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۲۹۱، وبخاری کتاب التفسیر آیہ سبّح اسم ربّک الاعلی [۲] ،، جلد ۱ ص ۲۴۶

[۳] ،، جلد ۳ صفحہ ۱۳۷،

اس حلقہ کے ماسوا اہر تعلیم یافتہ مسلمان ناخواندہ مسلمان کے لئے معلم تھا، عربوں کے جو وفد دور دور سے مدینہ منورہ آتے، وہ انصار کے مکانوں میں فروکش ہوتے تھے، جہاں انھیں کتاب وسنت کی تعلیم دیجاتی تھی، چنانچہ وفد عبد القیس کا بیان ہے، کہ

"انصار ہمیں ہمارے پروردگار کی کتاب اور ہمارے نبی کی سنّت کی تعلیم دیتے تھے"[۱]

پھر فتوحات کے بعد جب نظامِ حکومت کی تشکیل ہوئی، اور عمال مقرر ہوکر ولایتوں میں بھیجے جانے لگے تو آپ نے اُن کا مقصدِ سفر یہ بیان فرمایا، کہ

"(یہ بھیجے جاتے ہیں) تاکہ لوگوں کو قرآن اور اسلامی شریعت کی تعلیم دیں"[۲]

اس کے بعد خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں جب فتوحات کا سلسلہ وسیع ہوا، تو قرآن کی تعلیم کے لئے مستقل معلمین عمال کے ساتھ بھیجے گئے، جیسے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ بصرہ کے عامل بنائے گئے تو حضرت عمران بن حصین رضؓ قرآن مجید و شریعت اسلامی کی تعلیم کے لئے ان کے ساتھ کئے گئے، اسی طریقہ سے شام کی فتح کے بعد مختلف شہروں میں عمال کے علاوہ قرآن کی تعلیم دینے والوں کا تقرر ہوا، حضرت عبادہ بن صامت رضؓ نے معلمِ قرآن کی حیثیت سے حمص میں قیام فرمایا، حضرت معاذ بن جبل رضؓ فلسطین روانہ ہوئے اور حضرت ابو درداء رضؓ نے دمشق میں اقامت اختیار فرمائی[۳]، ان معلمین نے نو مفتوح شہروں میں قرآن مجید کی تعلیم کے لئے مکاتب قائم کئے، اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہوگیا، لوگ جوق جوق علم کی تحصیل کے لئے ان کے درس میں شریک ہوتے، حضرت ابو درداء رضؓ کے متعلق بیان کیا گیا ہے، کہ جب وہ دمشق کی جامع مسجد میں درس کے لئے بیٹھتے تھے، تو طلبہ کا اس قدر ہجوم ہوتا تھا، کہ گویا کسی بادشاہ کے استقبال کے لئے لوگ جمع ہوئے ہیں[۴]، صحابہ جہاں بیٹھتے، محفل کی شمع بن جاتے، اور لوگ علم حاصل کرنے کے لئے پروانوں کی طرح ان پر گرتے، ابو ادریس خولانی بیان

---

۱ مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۴۳۲ ۲ استیعاب تذکرہ حضرت معاذ بن جبل رضؓ عامل یمن ۳ اسد الغابہ ترجمہ حضرت عبادہ ابن صامت رضؓ ۴ تذکرۃ الحفاظ ترجمہ حضرت ابو درداء رضؓ

کرتے ہیں، کہ وہ ایک مرتبہ حمص کی مسجد میں گئے، تو ۳۲ صحابہ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے، وہ یکے بعد دیگرے اپنی روایتیں سناتے رہے، اور لوگ ہمہ تن گوش بن کر سنتے رہے،[۱]

صحابۂ کرام نے علم حدیث کی اشاعت کی خدمت مستقل طور پر انجام دی، جو جس شہر میں قیام پذیر تھا اس نے وہاں کی مسجد میں روایت وسماع کے لئے حلقہ قائم کر لیا تھا، مثلاً حضرت جابر بن عبد اللہؓ مسجد نبوی میں مستقل طور پر درس دیتے تھے[۲]، حضرت ابو درداءؓ دمشق کی مسجد میں بیٹھتے تھے[۳]، حضرت حذیفہ بن اسحاقؓ کوفہ کی مسجد میں درس کا سلسلہ قائم کئے تھے،[۴]

کتاب وسنت کی تعلیم واشاعت کیساتھ جب مختلف نئی صورتوں اور ضرورتوں میں کتاب وسنت پر قیاس کرکے مسائل مستنبط کرنے کی ضرورت پڑی تو ایسے اہل علم متعین کئے گئے، جو اس خدمت کو اپنی دینی اور علمی بصیرت سے انجام دیں اور لوگوں کو مسائل کے استنباط کے طریقے بتائیں، چنانچہ مختلف صحابہ اس خدمت پر مامور ہوئے، اور ان کے ذریعہ علم فقہ کی اشاعت ہوئی، مثلاً حضرت عبد الرحمٰن بن قاسمؓ شام میں[۵]، حضرت عبد اللہ بن معقل[۶] اور حضرت عمران بن حصینؓ بصرہ میں[۷]، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ مدائن میں[۸]، اور حضرت حبان ابن جبلہؓ مصر میں[۹] اس خدمت پر مامور تھے،

پہلے دور کے تعلیمی خصوصیات، یہ نظام دولت امویہ کے عہد کے ابتدائی دنوں تک جاری رہا، اس دور کے تعلیمی خصوصیات اجمالاً حسب ذیل تھے،

۱۔ علم، قرآن مجید، حدیث اور فقہ میں منحصر تھا، ان کے ماسوا کسی دوسرے علم کی اشاعت نہیں کی گئی،

---

[۱] مسند احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۲۲۰، [۲] حسن المحاضرہ جلد ۱ ص ۱۰۷، [۳] تذکرۃ الحفاظ [۴] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۳۰۶، [۵] تذکرۃ الحفاظ ترجمہ عبد الرحمن بن اسری، [۶] اسد الغابہ ترجمہ عبد اللہ بن معقل [۷] تذکرۃ الحفاظ ترجمہ عمران، [۸] یعقوبی جلد ۲ ص ۱۷۳، [۹] تہذیب التہذیب ترجمہ حبان،

۲- تعلیم کتابی نہ تھی، قولی اور سماعی تھی،

۳- تعلیم کیلئے کوئی معاوضہ لینا یا دینا ممنوع تھا، معلّین کے لئے معیشت کے دوسرے ذریعے تھے، یہانتک کہ ایک مرتبہ ایک مہاجر نے حضرت عبادہ بن صامت رض کو جن سے وہ قرآن پڑھتے تھے، ایک کمان ہدیہ میں بھیجی، تو آنحضرت صلعم نے اس کے لینے سے منع فرمادیا[1]

۴- استاذ، طالب علموں سے بڑی شفقت اور محبت کا سلوک کرتے تھے، جسکی بہ کثرت مثالیں ہیں

۵- مسجدیں، تعلیم گاہ کے طور پر استعمال کیجاتی تھیں،

۶- علم حدیث کے چرچے سے علم کی تحصیل کے لئے سفر کرنے کا رواج ہوا، خود صحابۂ کرام بھی ایک ایک حدیث کے تحقیق کے لئے ایک دوسرے کے پاس ایک شہر سے دوسرے شہر کو جاتے تھے، ایک مرتبہ آنحضرت صلعم نے کوئی بات بیان فرمائی تھی، اس موقع پر حضرت عقبہ بن عامر رض اور حضرت سائب بن مخلد رض حاضر تھے، حضرت سائب رض کو اس حدیث کے متعلق کچھ شبہہ ہوگیا، تو انھوں نے صرف اس شبہہ کو دور کرنے کے لئے مصر کا سفر کیا، اور وہاں پہنچ کر حضرت عقبہ رض سے اس حدیث کی بابت دریافت کیا[2]

۷- علمی سفر کے متعلق یہانتک احتیاط برتی جاتی تھی، کہ اسے خالص تحصیل علم کے لئے ہونا چاہئے تھا، اگر اس میں کوئی دنیاوی غرض وابستہ ہوجاتی، یا کسی شہر میں کوئی پہونچتا، اور ضمنی طور پر کچھ علم حاصل کرنا چاہتا، تو اسے مایوس ہونا پڑتا تھا، ایک مرتبہ ایک شخص حضرت ابودرداء رض کی خدمت میں مدینہ سے کسی حدیث کے متعلق دریافت کرنے کے لئے آیا، انھوں نے پہلے اس سے یہ اطمینان کرلیا، کہ یہ کسی دنیاوی غرض جیسے تجارت وغیرہ کے لئے نہیں آیا ہے، اسکے بعد اس سے حدیث بیان کی[3]

دوسرا دور	دوسرے دور کا آغاز دولت امویہ میں حضرت عمر بن عبد العزیز کی خلافت کے زمانہ سے ہوتا ہے،

علم کی اشاعت میں ان کے عظیم الشان کارنامے ہیں، انھی نے سب سے پہلے حدیثوں کے منتشر سرمایہ کو یکجا کرنے کیلئے

[1] ابوداؤد کتاب البیوع باب فی کسب العلم، [2] حسن المحاضرہ جلد۱ ص ۸۶ [3] مختصر جامع بیان العلم ص ۳۸،

صوبہ کے والیون اور شہرون کے عاملوں کے نام فرمان بھیجے کہ

"احادیثِ نبویہ کی تلاش کر کے انھیں لکھ لو کیونکہ مجھے علم کے مٹنے اور علماء کے فنا ہونے کا خوف ہے، اور صرف رسول اللہ صلعم کی حدیث قبول کیجائے"[1]

چنانچہ اس فرمان کے بموجب احادیث کا قیمتی سرمایہ جمع ہو گیا، سعد بن ابراہیم سے روایت ہے کہ

"ہم کو حضرت عمر بن عبد العزیز نے حدیث جمع کرنے کا حکم دیا، تو ہم نے دفتر کے دفتر حدیثیں لکھ لیں اور انھوں نے ان کا ایک ایک مجموعہ اپنی حکومت کے تمام حدود میں روانہ فرمایا"[2]

حدیثون کے جمع کرنے کا مقصد صرف فن حدیث کی تعلیم واشاعت تھا چنانچہ اسی فرمان میں آگے چل کر ہے:-

"علماء کو چاہیئے کہ علم کی اشاعت عام طور پر کرین اور تعلیم کے لئے درس کے حلقوں میں بیٹھیں تاکہ جو لوگ نہیں جانتے وہ جان لیں، کیونکہ علم صرف اسی وقت ضائع ہوتا ہے، جب وہ راز بن جاتا ہے"

ایک دوسرے فرمان میں لکھا:-

"اہل علم کو حکم دو کہ اپنی مسجدوں میں علم کی اشاعت کریں، کیونکہ حدیثیں فنا ہو رہی ہیں"[3]

حضرت عمر بن عبد العزیز نے نظامِ تعلیم مین ایک دوسری تبدیلی یہ کی، کہ پڑھانے والوں اور بعض اوقات پڑھنے والون کو معاش کی فکر سے آزاد کر کے ان کے لئے مستقل وظیفے جاری کرنے کی ابتداء کی، چنانچہ انھون نے والیوں کو لکھ بھیجا کہ

"جن لوگوں نے دنیا کو چھوڑ کر اپنے کو فقہ کی تعلیم کے لئے وقف کر دیا ہے، ان میں سے ہر ایک کو بیت المال سے سو سو دینار دو تاکہ وہ لوگ موجودہ حالت میں اس سے مدد حاصل کرین"[4]

---

[1] بخاری کتاب العلم جلد ۱ ص ۲۰، و فتح الباری جلد ۱ ص ۱۷۴، [2] مختصر جامع بیان العلم ص ۳۸، [3] سیرۃ عمر بن عبد العزیز (ابن جوزی)، [4] ایضاً ص ۹۵،

اسی طرح اس عہد مین نادار طلبہ کے لئے بھی وظیفے جاری کئے گئے، جس کا تذکرہ ابن عبد البر نے کیا ہے،[1]

اس کے ماسوا اسی زمانہ سے شروع ہو کر دولت عباسیہ کے ابتدائی زمانہ تک میں مختلف شرعی، ادبی، اور عقلی علوم کی تدوین ہوئی، اور غیر زبانوں کے علوم عربی میں منتقل کئے گئے، جس سے تصنیف، تالیف اور ترجمہ کا وسیع سلسلہ قائم ہو گیا، چنانچہ اس عہد تک علوم قرآن، حدیث، فقہ، کلام، مغازی، سیر، تاریخ، ادب، نحو، شعر، طب، فلسفہ، منطق، ریاضیات، اور ہندسہ وغیرہ کی تدوین ہو چکی تھی،

دوسرے دور کے خصوصیات، ان حیثیتون سے اس دور مین حسب ذیل تعلیمی خصوصیتوں کا اضافہ ہوا:۔

۱۔ علوم وفنون کا سرمایہ سینون سے نکل کر سفینوں میں آیا،

۲۔ تالیف، تصنیف اور ترجمہ کا سلسلہ قائم ہوا،

۳۔ کتب خانہ کا قیام عمل میں آیا،

۴۔ اساتذہ اور طلبہ کے وظائف مقرر کئے گئے،

۵۔ مسجدون میں تعلیم کے لئے درس کے مستقل حلقے قائم ہوئے،

۶۔ تعلیم عموماً مسجدوں ہی میں دی جاتی تھی، بلکہ اگر کسی نئی تعلیم گاہ کے قائم کرنے کی ضرورت ہوتی تو نئی مسجد ہی تعمیر کیجاتی تھی،[2]

۷۔ بعض اسلامی ملکون میں اہل علم کو اپنا تعلیمی شغل جاری رکھنے کے لئے جہاد کی خدمت سے بھی مستثنیٰ کیا گیا،[3]

طریقہ تعلیم اس دور میں بھی وہی رہا، جو پہلے دور میں تھا، یعنی استاد زبانی تعلیم دیتا تھا، لیکن اس طریقہ میں پچھلے دور سے اس دور میں یہ اضافہ ہوا کہ املا کا طریقہ جاری ہوا، استاذ جو کچھ درس دیتا شاگرد اسے لکھ لیتے، یا استاذ خود لکھاتا جاتا، اور طلبہ لکھتے جاتے،

---

[1] جامع بیان العلم ص ۸۰ [2] معجم البلدان جلد ۵، ص ۳۷۵ [3] ذکرۃ تدیہ [3] ص ۳۷۶،

۹- کتابون کے مصنفین بھی اپنی کتابون کی قرأت کراتے تھے،

۱۰- کتابوں کی قرأت وسماع کی سند واجازت کے رواج کی ابتدار بھی اسی دور میں ہوئی،[1]

تیسرا دور اس کے بعد اسلامی نظامِ تعلیم کا تیسرا دور شروع ہوا، اس میں تعلیمگاہون کے لئے مسجدون سے علحدہ کرکے عمارتین بنانے کا رواج ہوا، اگرچہ مسجدوں میں بھی تعلیم کا سلسلہ قائم رہا، تاہم تعلیمگاہوں کی علحدہ عمارتون سے اسلام کے تعلیمی نظام کی نئی تشکیل ہوئی، مدرسوں کے لئے قواعد وضوابط بنائے گئے، طلبہ اور اساتذہ کے لئے اقامت گاہیں تیار ہوئین، ملک کے چیدہ اہلِ علم اپنے عہدہ کے فرق وامتیاز کیساتھ بیش قرار تنخواہون پر معلمی کے منصب پر سرفراز کئے گئے، اور طلبہ کے تعلیمی وظیفے پابندی سے جاری کئے گئے، ان کے لئے تعلیم کے سامان مہیا کئے گئے، ان کے قیام طعام اور لباس کا انتظام کیا گیا،

تیسرے دور کے خصوصیات، ان حیثیتوں سے اس دور کے حسب ذیل نمایان خصوصیات قرار پاسکتے ہین،

۱- مدرسوں اور اقامت گاہوں کی تعمیر سے استادوں اور لڑکوں کی باہمی معاشرت کا آغاز ہوا،

۲- بڑے بڑے اوقاف کی بدولت علمار فراغ بالی سے اپنی خدمتین انجام دیتے رہے، اور لڑکون کیلئے بھی تعلیمی سہولتین بہم پہونچین،

۳- مدرسوں کی تعمیر اور اوقاف کا قیام دینداری کی ایک علامت قرار پائی، اور نیک دل مسلمانون نے آخرت کی بھلائی کے لئے مدرسے اور دار الاقامے قائم کئے، نیز مدرسوں کی تعمیر اس دور کے تمدن میں دنیاوی اعزاز اور سربلندی کا ذریعہ سمجھی گئی، جس کی وجہ سے امرار واہل مناصب نے مدرسوں کی تعمیر میں بڑھ بڑھ کر حصہ لیا،

---

[1] یہ حصہ مقدمۃ التربیۃ الاستقلالیہ از ص ۱۹ تا ص ۲۸، و تاریخ صقلیہ جلد دوم باب علوم وفنون از ص ۱۸۰ تا ۱۹۵ سے مستفاد ہے،

۴۔ اسلامی ملکون کی تعلیمی ترقی سے درس وتدریس کا پیشہ اس قدر معزز سمجھا جانے لگا، کہ اہل علم وزراء و امرا اپنی غیر معمولی مشغولیتون کے باوجود پڑھنے پڑھانے کے لئے بھی وقت نکالتے تھے، چنانچہ اس زمانہ کے امرأ کے سوانح میں ان کے اہلِ علم کے درس کے حلقہ میں بلا تکلف شریک ہونے، اور خود درس کا حلقہ قائم کرکے لوگوں کو پڑھانے کے واقعات ملتے ہیں،

۵۔ مختلف علوم وفنون کے لئے جدا گانہ مدرسے قائم کئے گئے،

۶۔ طریقہ تعلیم کے لحاظ سے اس دور میں بھی املا کا طریقہ جاری رہا، اور مصنفین اپنی کتابیں پڑھاتے تھے، لیکن اس دور میں کتابون کی قرات اور سماع کی سند اور اجازت کا طریقہ پہلے دور سے زیادہ اہتمام سے جاری ہوا، نیز اس دور میں ایک اضافہ یہ ہوا، کہ نصابِ تعلیم کی چیدہ کتابیں منتخب کی گئیں، اور ہر فن میں جو معیاری کتابیں نکلیں، انھیں درس کے نصاب میں داخل کیا گیا، ہر فن کے پڑھانے کے لئے مختصر رسالے تیار کئے گئے، لیکن پھر امتداد زمانہ سے نصاب درس میں غیر ضروری کتابیں بھی داخل ہوگئیں، اور مختلف زمانون میں نصاب کی اصلاح کی کوششیں جاری رہین،[1]

عہد اسلامی کے مختلف دورون میں اسلامی ملکوں میں تعلیم کے اہم مرکز

اسلامی نظامِ تعلیم کے ان مختلف دورون میں اسلامی ممالک کے مختلف شہر تعلیم کے اہم مرکز بنے رہے، جہان تعلیم کے سلسلہ کے تمام وسائل مہیا رہتے تھے، اور طلبہ دور دور سے پہونچ کر وہاں علم کی تحصیل کرتے تھے، یہ تعلیمی مرکز مختلف زمانوں میں بدلتے رہے ہیں، ابن خلدون نے اسکی یہ صحیح توجیہ کی ہے، کہ جس ملک کا تمدن جس قدر ترقی یافتہ رہا، اسی قدر وہان اعلیٰ تعلیم کے موقعے اور وسیلے پیدا ہوئے، اور پھر جس ملک کو تمدنی حیثیت سے زوال آیا، وہ اپنے تعلیمی مرکز کے امتیاز کو بھی کھو بیٹھا، چنانچہ وہ لکھتا ہے، :۔

"اس کا سبب یہ ہے جیسا کہ ہم دکھا چکے ہیں، کہ علوم کی تعلیم بھی منجملہ پیشوں کے ایک پیشہ ہے"

---

[1] ان مباحث کی تفصیل آگے آئیگی،

اور ہم یہ بھی دکھا چکے ہیں، کہ پیشے شہروں ہی میں زیادہ ہوتے ہیں، اور شہروں کی تمدنی ترقی اور تنزل کے اعتبار سے ان میں بھی بیشی اور کمی ہوتی ہے، جس قدر تمدنی لطافتیں بڑھتی ہیں، ان پیشوں میں بھی باریکیاں اور ندرتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں، کیونکہ یہ انسانی خاصہ ہے، کہ جب معاشی فراغ بالی حاصل ہوتی ہے، تو انسان کی زندگی میں مزید لطافت پیدا ہوتی ہے، اور ان میں علوم وصنائع سے شغف پیدا ہوتا ہے"

اسی اصول کے بموجب اسلامی عہد میں جو شہر تمدنی حیثیت سے کمال کے درجہ پر پہونچے، وہ تعلیم کے مرکز بھی قرار پائے، چنانچہ صحابہ کے زمانہ میں مدینہ منورہ کو قدرۃً مدینۃ العلم کا لقب حاصل تھا، پھر کوفہ وبصرہ کو یہ امتیاز حاصل ہوا، اس کے بعد بغداد اور نیشاپور مشرق میں اور قیروان اور قرطبہ مغرب میں علم کے شہر قرار پائے اور اسلام کے ابتدائی زمانہ میں انہی شہروں کو تعلیمی مرکز کی حیثیت حاصل رہی، چنانچہ ابن خلدون لکھتا ہے:۔

"بغداد، قرطبہ، قیروان، بصرہ، اور کوفہ کو دیکھو کہ جب یہاں اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تمدن پھیلا اور عمرانی ترقی کمال کے درجہ پر پہونچ گئی، تو یہاں علم کے سمندر جوش مارنے لگے، اور یہاں کے باشندے تعلیمی اصطلاحات اور مسائل کے استنباط میں تفنن طبع دکھانے لگے، لیکن جب یہاں کے تمدن کو زوال آیا، اور یہاں کے باشندوں میں ابتری پیدا ہوئی، تو وہ بساط الٹ گئی، اور علم اور تعلیم مفقود ہو کر یہاں سے دوسرے شہروں میں منتقل ہو گیا"[1]

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۰۶

اس کے بعد جن اسلامی شہروں کو سیاسی حیثیت سے بلندی حاصل ہوئی اور ان کی تمدنی ترقی کا دور آیا وہی شہر تعلیم کے مرکز بھی قرار پائے، لکھتا ہے:۔

"جب بغداد، بصرہ، اور کوفہ جیسی علم کی کانیں مٹ گئیں، تو اُن سے بڑے بڑے شہر پیدا ہوگئے، اور علم کا مرکز وہاں سے عراق عجم میں منتقل ہو کر خراسان و ماوراء النہر میں قائم ہوگیا، اور پھر قاہرہ میں منتقل ہوا، اور چونکہ قاہرہ کی تمدنی حیثیت مسلسل قائم رہی، اس لئے یہاں علم کا مرکز بھی ہر زمانہ میں موجود رہا، یہاں تک کہ جو لڑکے علم حاصل کرنے کے لئے مغرب سے مشرق جاتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں، کہ اہلِ مشرق کی عقل و ذہانت اہلِ مغرب سے زیادہ ہوتی ہے، اور وہ فطری طور پر ان سے زیادہ عقلمند اور تیز ہوتے ہیں،

اس طریقہ سے وہ مغرب اور مشرق کے باشندوں کی انسانی خصوصیتوں میں فرق سمجھنے لگے، حالانکہ یہ واقعہ صحیح نہیں ہے،

مشرق اور مغرب کی اقلیموں میں کوئی فرق نہیں ہے،..... بلکہ اہل مشرق تمدن کی ترقیوں کی وجہ سے اور مسلسل مشق جاری رہنے سے اہل مغرب سے بڑھ گئے ہیں، اور ان کی تمام عقلی ترقیوں کا حقیقی سبب صرف اسی قدر ہے"[1]،

ایک دوسرے مقام پر اس نے اپنے زمانہ یعنی آٹھویں صدی کے تعلیمی مرکزوں پر نظر ڈالی ہے جس سے اس عہد میں مختلف ملکوں کی تعلیمی حالت کا اندازہ ہوتا ہے، کہتا ہے:۔

اس زمانہ میں مغرب کے تمدن میں اختلال اور یہاں کی حکومتوں میں ابتری پیدا ہونے کی وجہ سے

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۰۴،

یہاں سے تعلیمی اعتماد اور مرکزیت فنا ہونے والی ہے، قیروان اور قرطبہ مغرب اور اندلس میں سب سے متمدن شہر تھے، انھیں پوری تمدنی ترقی حاصل ہوئی، اس لئے یہاں ہر قسم کے علوم اور پیشوں کے بازار گرم تھے، اور ان کے سمندر جوش مار رہے تھے، اور ایک زمانہ گذرنے سے یہاں تعلیم، لوگوں کی طبیعتوں میں راسخ ہوگئی تھی، جب یہ دونوں مرکز برباد ہوگئے، تو مغرب سے تعلیم بھی رخصت ہوگئی، صرف کسی قدر نام ونشان باقی رہ گیا، چنانچہ مراکش میں دولت موحدیہ کے عہد میں یہاں کی پچھلی تعلیمی ترقیوں کے اثر سے کچھ نشانات پائے گئے، لیکن حکومت کے ابتدائی زمانہ کے ہونے اور اس کے جلد ختم ہوجانے کی وجہ سے یہاں حضارت راسخ نہ ہوسکی تھی، البتہ مشرق سے چند اہلِ علم علوم حاصل کرکے لوٹے، اور ان کے ذریعہ سے تونس، تلمسان اور بجایہ میں علم کی روشنی پہونچی، لیکن مغرب کے دوسرے حصے جیسے فاس وغیرہ تعلیم کی خوبی سے اس وقت سے خالی ہوگئے، جب سے قرطبہ اور قیروان کے تمدن کو زوال آیا، اور ان باشندوں کی ذہنی ترقی کا موقع باقی نہیں رہا، یہی وجہ ہے، کہ اہلِ مغرب کے مدرسوں میں جو علوم ۱۶ سال میں لڑکوں کو ختم کرائے جاتے ہیں، وہ تونس میں صرف پانچ برس کی مدت میں پڑھا دیئے جاتے ہیں،

اسی طرح اہلِ اندلس بھی رسم تعلیم سے بیگانہ ہوچکے ہیں، دو سو سالوں سے وہاں مسلمانوں میں جو تمدنی ابتری پھیلی ہے، اس کی وجہ سے علم کی طرف سے ان کی رغبت جاتی رہی ہے، اب ان میں صرف کسی قدر عربیت اور ادب کا ذوق پایا جاتا ہے، ورنہ فقہ کا صرف نام باقی رہ گیا ہے اور عقلی علوم تو بالکل مفقود ہوچکے ہیں، کیونکہ دشمن اندلس کے صرف تھوڑے سے ساحلی حصہ کو چھوڑ کر پورے ملک پر قابض ہوچکے ہیں، اس لئے جو مسلمان وہاں موجود ہیں، ان کی توجہ زیادہ تر معاش کے حصول پر مبذول رہتی ہے، جس کی وجہ سے انھیں کسی دوسری طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے"[1]

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۷۲-۴۷۳،

پھر مشرق کے حال مین لکھتا ہے:۔

"مشرق میں اس زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں، کہ علم اور تعلیم کا مرکز قاہرہ بنا ہوا ہے، کیونکہ اس کی تمدنی حیثیت ہزاروں سال سے قائم ہے، اس لئے یہاں کی طبیعتوں میں صنائع پورے طور پر راسخ ہوچکے ہیں، اور انہی میں پیشۂ تعلیم بھی ہے، خصوصًا پچھلی دو صدیوں سے ترکوں کی دولت صلاحیہ ایوبیہ کے زمانہ میں تعلیمی حیثیت سے کمال کے درجہ پر پہونچ گیا ہے"[1]

اسی زمانہ میں ہندوستان میں بھی دہلی علم و تعلیم کے مرکز کی حیثیت سے روشناس تھا، چنانچہ قلقشندی نے آٹھویں صدی کے ہندوستان کے ذکر مین دکھایا ہے، کہ صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے قائم تھے[2]،

اس کے بعد دورِ حاضر سے کچھ پہلے تک عالم اسلامی میں تعلیم کے دو مرکز رہے، ایک مصر مین قاہرہ اور دوسرے ترکی میں قسطنطنیہ، اور دولت عثمانیہ کو اولیت کا یہ شرف حاصل ہے، کہ وہ اسلامی نظام تعلیم کو جدید شاہراہ پر لائی، اور نئی اصلاحین رائج کرکے نئے طریقوں پر مدرسوں کا نظام قائم کیا، اور یونیورسٹی کے طرز پر مدرسوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کیا،

عہد اسلامی کے ان مختلف دوروں میں تعلیم کے جو اہم مرکز رہے، ان میں وہان کے ممتاز اساتذہ کو اہمیت حاصل رہی، انہی کا تنہا وجود اس شہر میں خود مستقل یونیورسٹی تھا، اور جس طرح اس زمانہ میں یونیورسٹیون کی ڈگریان وقعت رکھتی ہیں، اس زمانہ میں ان اساتذہ کی شاگردی کی سند وقعت رکھتی تھی، کسی کے لئے فخر کا باعث نہ تھا، کہ مثلاً وہ مدرسہ نظامیہ یا مستنصریہ کا سند یافتہ ہے، بلکہ یہ باعثِ امتیاز تھا، کہ فلاں شیخ سے اسے تلمذ کا شرف حاصل ہے، اور جن شہروں میں ایسے مستند اساتذہ کا وجود قائم رہا، اس وقت تک ان شہروں کی تعلیمی مرکزیت برقرار رہی،

ان میں سے ہر شہر میں سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اہلِ کمال ہوتے تھے، اور ان کے وجود سے

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۰۶، [2] صبح الاعشیٰ جلد ۵ ذکر بلاد الہند،

علم و تعلیم کا سلسلہ قائم رہتا تھا، مسلم بن ابراہیم کہتے ہیں، کہ

"مین نے آٹھ سو شیوخ سے حدیث لکھی، مگر مجھے (بغداد کے) پل کو (جو دجلہ پر تھا) عبور نہیں کرنا پڑا"[1]

اسی طرح خلیفہ المقتدر باللہ نے ۳۱۹ھ میں ایک سلسلہ میں شہر کے طبیبون کو شمار کرایا، تو ان کی تعداد (۸۶۰) سے زیادہ نکلی، جن میں وہ ماہرین فن شامل نہ تھے جنھیں شہرت عام حاصل تھی، اور جن کی حذاقت اور کمالِ فن پر عام اتفاق تھا[2]، نضر بن شمیل بصرہ سے روانہ ہوئے، تو تقریباً تین ہزار صرف اہلِ علم نے انکی مشایعت کی[3]

(۳)

نظامِ مدارس و دارالاقامہ

درس گاہ کی عمارتیں۔ اسلامی نظامِ تعلیم کے پہلے اور دوسرے دور دن میں تعلیم مسجدوں کے صحنوں، میناروں کے سایوں، خانقاہوں کے حجروں اور علمار کے مکانوں میں جاری رہی، اس زمانہ میں اگر تعلیم گاہ کے لئے عمارت کی ضرورت پڑی، تو درس گاہ کی شکل کی عمارت کے بجائے نئی مسجد ہی تعمیر کی گئی، ابن حوقل سسلی کے حال میں لکھتا ہے،:-

"ان دس مسجدون میں جس کا میں نے تذکرہ کیا، ایک مسجد ابو محمد قنصی کی ہے، جس میں وہ نماز پڑھتے ہیں، اور اس کے پہلو میں بیس قدم پر ایک دوسری مسجد ہے جسکو انھوں نے اپنے لڑکے کی تعلیم گاہ کے طور پر تعمیر کرایا ہے"[4]۔

چوتھی صدی کے اخیر میں درس گاہوں کے لئے مستقل عمارت بنانے کی ابتدا ہوئی، اور اسے اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی، کہ ایک ہی صدی میں تمام اسلامی دنیا میں اس کا عام رواج ہوگیا، اور مدرسوں پر بڑی بڑی جائدادیں وقف کی گئیں، اور اسلامی تمدن نے ان کے لئے ہر قسم کے سامان مہیا کر دیئے اور ان کے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ا ص ۳۶۱، [2] عیون الاطبار جلد ا ص ۲۲۲، [3] وفیات الاعیان جلد ۲ ص ۱۶۱، [4] معجم البلدان جلد ۵، ص ۳۷۵،

بنا و قیام اور ان میں درس و تدریس کے لئے مفصل نظامِ عمل تیار ہو گیا،

سب سے پہلا مدرسہ، اسلام میں سب سے پہلا مدرسہ کون سا تعمیر ہوا، ؟ اس کا جواب اسلامی مدارس کی تاریخ بیان کرنے والے کے ذمہ عائد ہو گا، ہم یہاں بر سبیلِ ذکر صرف علامہ سبکی کا ذیل کا بیان پیش کر دیتے ہیں جس سے کم سے کم یہ معلوم ہو جاتا ہے، کہ نظام الملک طوسی کا مدرسہ نظامیہ بغداد جیسا کہ اب تک سمجھا جاتا ہے، پہلا مدرسہ نہیں ہے، علامہ سبکی فرماتے ہیں :۔

"یہ گمان کیا جاتا ہے، کہ نظام الملک طوسی ہی نے سب سے پہلے مدرسوں کی بنیاد رکھی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ مدرسہ بیہقیہ نیشاپور نظام الملک کی پیدائش سے بھی پہلے قائم ہو چکا تھا، نیز مدرسہ سعدیہ نیشاپور جسے سلطان محمود کے بھائی نصر بن سبکتگین نے اوس زمانہ میں تعمیر کرایا تھا جب وہ وہاں کا والی تھا، تیسرا مدرسہ بھی نیشاپور ہی میں تھا، جسے واعظ و صوفی ابو سعید اسماعیل بن علی بن مثنیٰ استرآبادی نے بنایا تھا، چوتھا مدرسہ بھی یہیں تعمیر ہوا، جسے ابو اسحٰق اسفرائنی نے تعمیر کرایا، یہ صریح واقعہ ہے، کہ یہ مدارس اس سے پہلے تعمیر پا چکے تھے، البتہ میرا گمان ہے کہ نظام الملک کو اس اولیت کا شرف ضرور حاصل ہے، کہ اس نے طلبہ کے لئے وظیفے مقرر کئے، کیونکہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آیا اس سے پہلے بھی مدرسوں میں طالب علموں کے لئے وظیفے ہوتے تھے، یا نہیں،"[1]

حضرۃ الاستاذ مولینا سید سلیمان ندوی نے "خیام" میں اس کے تعلق سے نیشاپور کے مدرسون پر بھی نظر ڈالی ہے، جن میں مذکورۂ بالا مدرسون کا بھی ذکر آیا ہے، لیکن موصوف نے سبکی ہی کے ایک دوسرے بیان سے نیشاپور کے پہلے مدرسہ کا بانی وہان کے سامانی والی ناصر الدولہ ابو الحسن سیمجوری متوفی ۳۴۰ھ کو قرار دیا ہے، جس نے امام ابو بکر محمد بن حسن بن فورک متوفی ۴۰۶ھ کے لئے اسے تعمیر کرایا تھا،

اس کے بعد دوسرا مدرسہ بیہقیہ قرار پاتا ہے، جس میں امام الحرمین نے تعلیم پائی، اور نظام الملک کی ولادت

[1] طبقات الشافعیہ جلد ۳ ص ۱۳۷،

(۴۰۰ھ) (۴۱۰ھ) سے پہلے تعمیر ہوا، پھر تیسرا اسعدیہ ہے جس کا تذکرہ اوپر گذرا، چوتھا مدرسہ ابو اسحٰق ابراہیم اسفرائنی متوفی ۴۱۸ھ کے لئے بنا، پانچواں استرابادی والا مدرسہ، چھٹا تغرل بیگ نے ۴۳۷ھ میں تعمیر کرایا، اور ساتواں مدرسہ نظامیہ نیشاپور ہے، جسے نظام الملک نے اپنی وزارت کے زمانہ (۴۵۶ھ) کے بعد امام الحرمین (۴۱۹ھ، ۴۷۸ھ) کے لئے بنوایا تھا[1]،

ہندوستان کا پہلا اسلامی مدرسہ

ہندوستان میں مدرسہ کی سب سے پہلی عمارت غالباً ناصر الدین قباچہ نے مولانا قطب الدین کاشانی کے لئے ملتان میں بنوائی، اور اس میں حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی (مولود ۵۷۸ھ) نے تعلیم پائی[2]،

اسلامی نظامِ تعلیم کا مذہبی ہونا اور قیامِ مدارس کی شرطِ اوّل

اسلام کے تعلیمی نصب العین سے یہ آشکارا ہو چکا ہے، کہ اسلامی نظامِ تعلیم کی ایک اہم خصوصیت اس کا مذہبی ہونا ہے، اس لئے مدرسوں کے قائم کرنے میں بھی اس کی یہ خصوصیت سب سے نمایاں رہی ہے،

یہ حقیقت ہے کہ قوموں کے عروج اور ترقی میں ان کے مدرسے بڑی اہمیت رکھتے ہیں، قومیں افراد سے بنتی ہیں، اور افراد کی ان کے بچپن ہی سے ذہنی، اخلاقی و روحانی تعلیم و تربیت مدرسوں ہی کے ذریعہ انجام پاتی ہے، اس لئے اگر مدرسے پاکیزہ ذہنی، اخلاقی اور روحانی تعلیمات کی درس گاہ ہوں گے، تو ان سے ایسی قوم تیار ہوگی، جو زندگی کی صحیح شاہراہ پر چل کر اپنے وجود سے دنیا میں انسانوں کے مقصدِ تخلیق کو پورا کرے گی،

اس لئے مسلمانوں نے مدرسوں کے قائم کرنے میں یہ اولین نقطہ سامنے رکھا، کہ وہ افرادِ انسانیت کے لئے صحیح اور پاکیزہ اخلاق و روحانیت کی تربیت گاہ ہوں، اور اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے

---

[1] خیام ص ۳ تا ۵، بحوالہ طبقات سبکی جلد ۳ ص ۵۲، ۳۷، ۲۵۲۱، تاریخ یمینی عتبی ص ۳۲۴، ابن خلکان جلد ۱ ص ۴ و ترجمہ ابن فورک و امام الحرمین و خطیب، و سفر نامہ ناصر خسرو ص ۴۳ [2] تاریخ فرشتہ جلد ۲ ص ۴۰۴،

بڑی بلند نظری سے خود ان مدرسون کے لئے یہ شرط قرار دی کہ وہ پاکیزہ اخلاقی و روحانی مقاصد حسن نیت اور اخلاص عمل کے ساتھ قائم کئے گئے ہوں اور ان کا سرمایہ معقول اور جائز ذرائع اور پاک روزی سے حاصل کیا ہوا ہو، ورنہ اگر وہ کسی بری نیت اور دنیاوی غرض جاہ و عزت اور ناموری اور شہرت کے لئے قائم کئے گئے ہون یا جور و ظلم سے حاصل کی ہوئی دولت اس میں لگائی گئی ہو، یا اگر کسی نے اس کی تعمیر کے وقت اپنے اثر و اقتدار کو بے محل استعمال کرکے زمین اور تعمیر کے سامان غاصبانہ حاصل کئے ہون، یا مزدوروں کی اجرت نہ ادا کی ہو، تو ایسے مدرسوں کی عمارتوں میں پاکیزہ اخلاق اور روحانیت کا ماحول پیدا نہیں ہوسکتا ہے، اس لئے اس عمارت میں پڑھنے پڑھانے والے اور سکونت اختیار کرنے والے بھی محاسن اخلاق سے آراستہ نہ ہوسکیں گے، اور صحیح اخلاقی اور روحانی تجلیات سے محروم رہیں گے، اور ان میں ایسی ذہنی استعداد مفقود ہوگی، کہ وہ عملی دنیا میں اپنے دل و دماغ سے ایسی شاہراہ پر چلیں، جو انسانیت کی تکمیل تک انہیں پہونچائے، اور ان کے وجود سے انسانی تخلیق کا مقصد پورا ہو، اسلئے حقیقی تعلیم و تربیت صرف انہی مدرسوں میں حاصل ہوسکتی ہے، جو حسن نیت اور اخلاص عمل کیساتھ بلند مقاصد پیش نظر رکھ کر قائم کئے گئے ہوں، چنانچہ قاضی ابن جماعۃ علماء و طلبہ کے لئے یہ اصول کار بیان کرتے ہیں، کہ

"حتی الامکان تعلیم کے لئے ایسے مدرسوں کو منتخب کرنا چاہئے جن کے بانی زہد و تقوی سے قریب اور بدعتوں سے دور رہے ہوں، اور یہ گمان غالب ہو کہ وہ مدرسہ اور اس کا وقف جائز پہلوؤں سے قائم کیا گیا ہے، اور اس میں پاک روزی کی کمائی لگائی گئی ہے، کیونکہ جس طرح کھانے اور کپڑوں میں جائز اور ناجائز کی احتیاط ضروری ہے، اسی طرح قیام کی جگہ میں بھی اسے دیکھنا ضروری ہے"[1]

یہی وجہ ہے کہ اسلامی دور میں جو مدرسے قائم کئے گئے، اس عہد کے علماء اور طلبہ ان کے بانیون کے ذاتی خصائل اور اخلاق اور مدرسہ کی تعمیر کی نوعیت کی تحقیق کرتے تھے، اور جو مدرسے بلند مقاصد کیساتھ بہتر طریقے سے تعمیر پاتے، لڑکے ان میں جوق جوق تعلیم کے لئے داخل ہوتے تھے، اور علماء ان میں پڑھنے پڑھانے

---

[1] تذکرۃ السامع ص ۱۹۳، ۱۹۶، و حاشیہ صفحہ مذکور،

کو اُخروی سعادت سمجھتے تھے، اور جو مدرسے غلط بنیادوں پر قائم کیے جاتے، ان میں ایک تو متدین اہل علم درس
و تدریس کے لئے تیار نہ ہوتے، اور اس کے علاوہ وہ مدرسے طلبہ کے اژدحام سے بھی خالی نظر آتے تھے، مقریزی
نے مصر کے بہت سے مدرسوں کا ذکر کیا ہے، اس نے اس سلسلہ مین اسی نقطہ نظر سے ان کے بانیون کے صلاح و
تقوی اور خصوصًا مدرسہ کی تعمیر جس نوعیت سے عمل میں آئی ہو، اس کا تذکرہ کیا ہے، تاکہ ان کی زندگی کے مطالعہ
سے ان کے قائم کیے ہوئے مدرسہ کی حیثیت آشکارا ہو، اور طلبہ کو مدرسوں کے انتخاب میں آسانی حاصل ہو، مثلاً
مدرسہ صاحبیہ بہائیہ کے ضمن میں لکھتا ہے:-

"اس مدرسہ کو الوزیر الصاحب بہاء الدین علی بن محمد بن سلیم بن حنا نے ۶۵۴ھ میں تعمیر کرایا،......
اس کی دادودہش بہت ہے، وہ فقراء سے فراخ دلی سے حسنِ سلوک کرنے، نیکوں اور پرہیزگاروں
کیساتھ حسنِ عقیدت رکھنے اور ان کی اطاعت کرنے ان کی حالتوں اور ضرورتوں سے باخبر رہنے اور
ان کے پورا کرنے اور ان کے حکموں کو جلد ماننے اور مشتبہ مالوں سے پرہیز کرنے اور بہ کثرت خفیہ اور علانیہ
صدقات کرنے مین اپنی حد سے بڑھا ہوا تھا، یہانتک کہ اس نے اپنی وزارت کے زمانہ مین کسی
شخص سے کوئی ہدیہ قبول نہیں کیا ہوا سوائے اس کے کہ کسی فقیر یا شیخ سے برکت حاصل کرنے کی نیت
سے کچھ لے لیا ہو،......"

اس مدرسہ کے بانی کی اس دینداری اور تقوی کا یہ اثر تھا، کہ مقریزی لکھتا ہے کہ
"یہ دنیا کے بڑے مدارس میں سے اور مصر کا سب سے بڑا مدرسہ ہے، لڑکے اس میں داخل ہونے اور اس
کے دارالاقامہ میں رہنے کے لئے دوسرے پر سبقت کرتے ہیں"[1]

اسی طرح مدرسہ قطبیہ کی بناء و تعمیر کے متعلق لکھتا ہے:
"یہ مدرسہ مونسہ خاتون ...... متوفی ۶۹۳ھ کی طرف منسوب ہے، وہ محدثہ تھیں، حافظ ابوالعباس

[1] خطط مصر مقریزی جلد ۲ ص ۳۷۰، ۳۷۱،

احمد بن محمد ظاہری ان کے شاگردوں میں سے تھے، وہ عاقلہ دیندار...... اور بہت خیرات و صدقات کرنے والی تھیں، انھوں نے وفات کے وقت بہت بڑی دولت چھوڑی، اور ایک مدرسہ کی تعمیر کی وصیت کی، جس میں فقیہ اور قاری درس دیں، اور نیز اس دولت سے جائداد خرید کر وقف کرنے کی وصیت کی، چنانچہ اس مدرسہ کی تعمیر ہوئی، اور اس میں مذہب شافعی و حنفی کے درس قائم کئے گئے، اور تعلیم قرآن کے لئے قاری مقرر کئے گئے یہ مدرسہ آجتک معمور ہے"[1]

اسی طرح امیر علاء الدین طیبرس متوفی ۷۱۹ھ نے جامع ازہر کے پہلو میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا، جو مدرسہ طیبرسیہ کے نام سے موسوم ہوا، اس کی عمارت ایسی حسین اور نادر تیار کرائی تھی، کہ مقریزی کے بقول اس عمارت کی تعمیری صنعتوں کی نقل اوتارنی ممکن نہ تھی، ۷۰۹ھ میں یہ عمارت مکمل ہوئی،

اس مدرسہ کے بانی کے حسن نیت کا اندازہ اس سے ہوگا، کہ عمارت کی تکمیل کے بعد جب اس کے کثیر اخراجات کی فرد حساب اس کے سامنے پیش کی گئی تو اس نے پانی سے بھرا ہوا ایک طشت منگایا، اور حساب دیکھے بغیر حساب کے تمام کاغذات اس طشت میں یہ کہکر ڈال دیئے، کہ

"جو چیز اللہ کے لئے نکال چکے ہم اس کا حساب نہیں کریں گے"[2]

دوسری طرف جو مدرسے ظلم اور زیادتی کی بنیادوں پر قائم کئے گئے، مقریزی نے ان کے حالات کھول کر لکھے ہیں، جیسے قاہرہ کا ایک مدرسہ اقبغاویہ تھا، جسے امیر علاء الدین اقبغا عبد الواحد نے تعمیر کرایا تھا مقریزی اس مدرسہ کے متعلق لکھا ہے؛:-

"یہ مدرسہ ظلم کی بنیاد پر قائم کیا گیا، یہی وجہ ہے کہ اس میں مساجد کی سی دینی رونق اور عبادتخانوں جیسی مذہبی عقیدت و محبت لوگوں کے دلوں میں موجود نہیں ہے، کیونکہ اقبغا عبد الواحد نے زمین غصب سے حاصل کرنے کے بعد اس پر یہ مدرسہ بنوایا ہے اس نے نائب السلطنت ایدمر الخلی کے وارثوں کو

---

[1] خطط مقریزی جلد ۲ ص ۳۶۸، [2] ، جلد ۲ ص ۳۸۳،

قرض دیا تھا، اور انھیں اس وقت تک کے لئے چھوڑ دیا کہ وہ سب کچھ خرچ کر لیں، اور ان کے پاس ادا کرنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے، چنانچہ جب ان لوگوں کے پاس فوری طور پر قرض ادا کرنے کی کوئی صورت نہیں رہی، تو اس نے اس کے ادا کرنے کا سختی سے مطالبہ کیا، اور وہ لوگ اس کے تند تقاضوں سے اسے اپنا مکان دینے پر مجبور ہو گئے، چنانچہ اس نے اسی مکان کو مسمار کر کے اس کی جگہ یہ مدرسہ تعمیر کرایا، اور اسی طریقہ سے زمین کے چند اور قطعے لوگوں سے چھین کر اس میں ملا دیے، بلکہ جامع مسجد کی فصیل کا ایک حصہ بھی اس میں شامل کر دیا ہے،

اس کے بعد اس نے شہر کے تمام معماروں بڑھیوں سنگ تراشوں اور مزدوروں کو جمع کیا، اور یہ قرار دیا کہ ان میں سے ہر ایک شخص ہفتہ میں ایک ایک دن یہاں آکر بلا اجرت کام کیا کرے، چنانچہ قاہرہ و مصر میں جتنے معمار اور کاریگر موجود تھے، وہ ہفتہ میں ایک دن اس میں کام کرنے کے لئے آنے لگے، اور اس امیر کے جو کارندے کاریگروں اور مزدوروں سے کام لیتے، وہ بھی اپنے آقا کی طرح بڑے ظالم اور سنگ دل تھے، اور معماروں اور مزدوروں کے ساتھ بڑی سختی کا برتاؤ کرتے تھے،

پھر تعمیر کے لئے جس قدر پتھر اینٹ، چونے، لکڑی، آلاتِ تعمیر اور دوسرے سامانوں کی ضرورت ہوئی وہ سب بھی بغیر ایک حبہ قیمت ادا کئے ہوئے خواہ غصب کر کے حاصل کئے گئے، یا سلطانی مال میں خیانت کر کے اس عمارت میں چیزیں لگائی گئیں کیونکہ حکومت کی تعمیر کا صیغہ اسی کے ہاتھ میں تھا، پھر ان سب حرکتوں کے علاوہ جب تک اس مدرسہ کی تعمیر جاری رہی، اور وہ جب کبھی اس کی تعمیر کے زمانہ میں اس کو دیکھنے آیا، تو اس نے کاریگروں کو ہر مرتبہ بڑی بے دردی سے پیٹا"۔

جب یہ عمارت مکمل ہو گئی، اور اس میں درس کا وقت آیا، تو اس نے اس کی افتتاح کا جلسہ منعقد کیا، جس میں مصر کے فقہاء و قضاۃ بلائے گئے لیکن اسے کوئی ایسا متدین عالم دین نہ مل سکا، جس کی تولیت میں اس مدرسہ کو دیتا، البتہ جاہ پسند دنیا دار علماء اس کی جانب متوجہ ہوئے، اور اس کی تولیت کی خواہش

ظاہر کی، انہی میں شریف شرف الدین علی بن شہاب الدین نقیب الاشراف و محتسب قاہرہ بھی تھے، انہوں نے اس مدرسہ کی صدارت اور تولیت کیلئے امیر اقبغا سے گفتگو کی، اور اسے اپنی طرف مائل کرنے کے لئے اس مدرسہ کے ہال کے لئے آٹھ ہزار درہم چاندی کی قیمت کا ایک قالین رشوت میں دیا، جو افتتاح کے جلسہ کے دن ہال میں بچھایا گیا، لوگوں کا عام خیال تھا کہ امیر اقبغا اس موقع پر اس محتسب کے مدرسہ کے صدر مقرر ہونے کا اعلان کر دے گا، لیکن جب مجمع اکٹھا ہوگیا، تو امیر اقبغا نے خلاف توقع اعلان کر دیا، کہ وہ اس زمانہ میں کسی شخص کو اس کی تولیت سپرد نہیں کرے گا، اور لوگ مدرسہ کا افتتاح کئے بغیر منتشر ہوگئے،[۱]

مدرسوں اور تعلیمگاہوں کی مختلف قسمیں، اسلامی عہد میں مختلف قسم کے مدرسے اور تعلیمگاہیں تھیں:۔

۱۔ **مکاتب** جن میں ابتدائی تعلیم دیجاتی تھی،

۲۔ **مدارس عامہ** جن میں شرعی علوم، ادب اور عقلی علوم پڑھائے جاتے تھے،

۳۔ **مدارس قرآن** جو قرآن مجید کے درس کے لئے خاص تھے، جیسے سسلی اور واسط میں قائم تھے[۲]

۴۔ **دارالحدیث** کے نام سے علم حدیث کی تعلیم کے لئے عمارتیں بنائی گئی تھیں، جن میں صرف حدیث کی روایت و سماع و قرأت ہوتی تھی، جیسے نورالدین محمود بن زنگی نے دمشق میں اور الکامل ناصر الدین نے قاہرہ میں بنوائے تھے،[۳] دمشق کا دارالحدیث صاحب الجواہر المضیہ کے بقول روئے زمین کا سب سے پہلا دارالحدیث تھا،[۴]

۵۔ **مدارس فقہ**، فقہ حنفی اور شافعی کی تعلیم کے لئے علیحدہ علیحدہ مدرسے قائم کئے جاتے تھے، دمشق حلب اور مصر وغیرہ کے حالات میں ایسے بہت سے مدرسوں کا تذکرہ خطط مقریزی اور حسن المحاضرہ سیوطی میں آیا ہے، نیز بعض مدرسوں میں فقہ حنفی و شافعی دونوں کی تعلیم کے لئے درس کے حلقے ہوتے تھے،[۵]

---

[۱] خطط مقریزی جلد ۲ ص ۳۸۳-۳۸۴ [۲] رحلۃ ابن جبیر ص ۲۳۲، رحلہ ابن بطوطہ جلد ۱ ص ۱۳۵ [۳] خطط مقریزی جلد ۲ ص ۳۷۵ [۴] الجواہر المضیہ جلد ۲ ص ۱۵۷ [۵] خطط جلد ۲ ص ۳۶۳، ۳۹۲، ۳۶۸، ۴۰۱ وغیرہ،

۶۔ مدارس طبیہ۔ علمِ طب کے لئے علٰحدہ مدرسے قائم ہوئے، جیسے سلرنو اور بغداد اور قاہرہ میں طبی مدرسے کھولے گئے، نیز طب کی تعلیم عام مدرسوں میں بھی دی جاتی تھی، اور ہسپتالوں میں عملی تجربے سکھائے جاتے تھے،

مستقل مدرسوں کے قائم ہو جانے کے باوجود اسلامی دنیا کی مسجدوں میں علما کے درس کے حلقے قائم رہے، جن میں کوئی فن تفسیر پڑھاتا، کوئی حدیث کی روایت کرتا اور کوئی فقہ پر درس دیتا تھا، اسی طرح ادب شعر اور عقلی علوم کے درس کے حلقے بھی قائم ہوتے تھے،

۸۔ بعض اساتذہ ہفتہ میں ایک دفعہ اپنا حلقہ منعقد کرتے تھے، وہ دن ان کے درس اور خطبہ کے لئے مقرر ہوتا تھا، جس میں بڑا اجتماع ہوتا تھا خطیب شیخ ابوبکر سجاد کے متعلق لکھتا ہے:۔

"سچے تھے، علم رکھتے تھے، سنن میں ایک بڑی کتاب تصنیف کی، جامع منصور میں ان کا حلقہ جمعہ کے دن قائم ہوتا تھا جمعہ کی نماز کے پہلے فتوی کے لئے اور نماز کے بعد املا اور خطبہ کے لیے"[1]

حلقوں میں اکابر علمائے عصر کی شرکت وکثرت تلامذہ

ان حلقوں میں بلا امتیاز بڑے بڑے علما شریک ہوتے تھے، اور اپنے معاصرین کے علم سے استفادہ کرتے تھے، ابن خلکان حضرت ربیعہ کے متعلق لکھتا ہے:۔

"پھر ربیعہ مسجد کو روانہ ہوئے، اور اپنے حلقہ میں بیٹھے، مالک حسن، ودیگر معززین شہر مدینہ اس حلقہ میں شریک ہوئے، اور دوسرے لوگوں کا اس میں ازدحام ہوگیا"[2]

ان حلقوں میں شاگردوں اور عام سننے والوں کی بڑی جماعت شریک ہوتی تھی، مثلاً ابو الحسن علی بن عاصم واسطی کے جو عراق کے امام وقت تھے، درس کے حلقہ میں تیس ہزار سے زیادہ مجمع ہوتا تھا،[3] اور یزید بن ہارون متوفی ۲۰۶ھ کی مجلس میں ۷۰ ہزار سے زیادہ آدمی امنڈ آتے تھے،[4]

علامہ شبلی مرحوم لکھتے ہیں:۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۸۰، [2] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۲۲۹، [3] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۹۱، [4] ایضاً جلد ۱ ص ۲۹۲،

"علامہ ذہبی طبقات میں ابوالتقی متوفی ۲۵۱ھ کے ترجمہ کے بعد لکھتے ہیں، کہ اس زمانہ کے بعض حلقۂ درس ایسے ہوتے تھے، جن میں دس ہزار سے زائد دواتیں، رکھی جاتی تھیں، اور لوگ احادیثِ نبوی لکھتے تھے، اس بڑے مجمع میں دو سو امام حاضر ہوتے تھے، جو اجتہاد و فتوی دینے کی پوری قابلیت رکھتے تھے"۔

خطیب مورخ بغداد علامہ ابو حامد اسفرائنی کے حلقہ میں خود شریک تھا، اس کا بیان ہے کہ سات سو طلبہ درس میں حاضر تھے، فراءنحوی نے کتاب المعانی کا جب لکھ دیا، تو حاضرین میں ۸۰ صرف قاضی تھے، رضی الدین نیشاپوری کے حلقۂ درس میں، چار سو فارغ التحصیل اہلِ علم حاضر تھے، بصرہ کی جامع مسجد میں امام بخاری نے جب مجلسِ املا منعقد کی تو ہزار کے قریب محدثین، فقہا، خطبا، اہلِ مناظرہ شامل ہوئے، خود امام بخاری سے جن لوگوں نے صحیح بخاری کی سند حاصل کی ان کی تعداد قریباً نوے ہزار ہے[۱]"

سلیمان بن حرب بصری قاضی مکہ بغداد آئے، تو خلیفہ مامون نے ان کی حدیث کی مجلس کا اہتمام کیا، قصرِ خلافت کے پاس منبر کی طرح ایک اونچی جگہ بنائی گئی، اور میدان میں حدیث سننے والے جمع ہوئے، تخمینہ کیا گیا کہ اس میں چالیس ہزار اشخاص شریک ہوئے، خود خلیفہ مامون بھی مجلس میں حاضر تھا، اور شیخ کی حدیثیں اپنے قلم سے لکھتا جاتا تھا[۲]،

محدث عاصم بن علی جب بغداد آئے اور شہر کے باہر نخلستان میں درسِ حدیث کا حلقہ قائم کیا گیا، اس میں ایک خلقت امنڈ آئی، خلیفہ ہارون رشید بھی اس مجلس میں آیا، شیخ ایک اونچے چبوترے پر بیٹھے تھے، اور خلیفہ ایک خمدار کھجور کے تنہ پر بیٹھ کر حدیثیں لکھتا تھا، اس مجلس کا اندازہ کیا گیا، تو ایک لاکھ بیس ہزار نفوس نکلے[۳]

ابو مسلم صاحبِ سنن بغداد آئے تو ان کے حلقہ میں سات مستملی اس طریقے کھڑے کئے گئے کہ ایک اپنی

---

[۱] مقالاتِ شبلی جلد ۳ ص ۸۰ [۲] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۳۶۰ [۳] ص ۳۶۳، ۳۶۴،

آواز دوسرے تک پہونچائے، اس میدان کی پیمائش کی گئی، اور دواتیں شمار کی گئیں تو ۴۰ ہزار سے زیادہ نکلیں،
اور جو لوگ کاغذ اور دوات کے بغیر صرف سننے کے لئے شریک ہوئے تھے، وہ ان کے علاوہ تھے[۱]

شیخ ابوبکر جعفر فریابی کی مجلس میں ۳۱۶ مستملی اور حاضرین ۳۰ ہزار کے قریب تھے،[۲]

امام بخاری کے صرف ایک شاگرد سے ۹۰ ہزار طلبہ نے صحیح بخاری کی سند حاصل کی تھی،[۳]

اوقاف جیسا کہ اوپر کہا گیا، مدرسون کی تعمیر کے ساتھ ان کے مصارف کے لئے بڑے بڑے اوقاف کئے گئے،
جن سے معلموں اور طالب علمون کے وظیفے جاری کئے جاتے اور مدرسوں کی دوسری ضرورتیں پوری ہوتی تھیں،
نظام الملک طوسی کے اوقاف جو اس نے مدرسوں کے لئے اپنی جاگیروں کا دسوان حصہ کیا اور دو لاکھ دینار
مدرسہ نظامیہ بغداد پر کئے، وہ عام شہرت رکھتے ہیں، اس طرح مستنصر نے مدرسہ مستنصریہ کے لئے جو مواضع وقف
کئے تھے، انکی آمدنی ستر ہزار مثقال سونا تھی، جو آج کل کے حساب سے بقول مولینا شبلی مرحوم ساڑھے چار لاکھ سالانہ
ہوتی ہے[۴]، ابن جبیر بغداد کے مدرسوں کے حال میں لکھتا ہے :-

"یہاں ۳۰ مدرسے ہیں، اور یہ سب مشرقی جانب ہیں، ان میں سے کوئی مدرسہ ایسا نہیں جو
عظیم الشان قصر سے کم ہو، ان میں سب سے بڑا اور مشہور نظامیہ ہے، اسے نظام الملک نے قائم کیا تھا،
اور ۵۰۴ھ میں اس کی تجدید ہوئی، ان مدرسون کے لئے بڑے اوقاف ہیں جن کی آمدنی سے
یہان کے استادون اور طالب علموں کو وظیفے دئے جاتے ہیں[۵]"

اوقاف کا یہ سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا، بلکہ مشکل سے کوئی ایسا مدرسہ ہوگا جس کے اخراجات کیلئے
کوئی آمدنی وقف نہ کی گئی ہو، ان کے ذریعہ امراء اور ارباب خیر خدا کی راہ میں اپنی دولت صرف کر کے اپنی آخرت
کیلئے ذخیرہ جمع کرتے تھے، خصوصاً پانچویں سے آٹھویں نویں صدی تک اس کا بہت رواج تھا،

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۹۶ [۲] ایضاً ص جلد ۲ ص ۲۶۲ [۳] مقدمہ فتح الباری ص ۵۰۰، [۴] مقالات شبلی جلد ۳
ص ۷۴، [۵] رحلۃ ابن جبیر ص ۲۲۹،

ابن خلدون نے مصر میں اوقاف کی کثرت کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا ہے، کہ دولت صلاحیہ کے زمانہ سے مصر کے امرا جو زیادہ تر غلاموں اور موالیوں میں سے تھے، حکومت کے روز روز کے انقلاب سے خائف تھے، اس لئے وہ بڑے بڑے اوقاف کر کے اپنے لڑکے کے حقوق ان سے متعلق کر دیتے تھے، تاکہ حکومت کے انقلاب کا اثر جائداد کی ضبطی کی صورت میں ظاہر نہ ہو، چنانچہ ان اوقاف کی مدد سے مصر میں بہت سے مدرسے زاویے اور رباط تیار ہو گئے، اور علما، اور طلبہ کے معقول وظیفے جاری ہو گئے اس کے ساتھ ابن خلدون نے تصریح کیساتھ یہ بھی اقرار کیا ہے، کہ اس زمانہ میں لوگوں میں جائداد یں وقف کر کے کار خیر انجام دینے کا حوصلہ بھی پیدا ہو گیا تھا، [1]

بعض وقف کرنے والے اپنے اوقاف کے ساتھ مختلف شرطیں لگا دیتے تھے، جیسے ان کے وقف سے صرف حنفی طلبہ کو وظیفے دیئے جائیں، خاص طور پر مصر میں حنفیوں اور شافعیوں نے اپنے اپنے مذہبوں کیلئے بڑے بڑے وقف کئے تھے، مصر میں ان اوقاف کا یکجا انتظام تھا، پہلے شافعیوں اور حنفیوں دونوں کے اوقاف کا متولی شافعی قاضی القضاۃ ہوتا تھا، اس رسم میں ایک ہندوستانی عالم سراج ہندی نے جو مصر میں حنفیوں کے قاضی القضاۃ تھے، تبدیلی کرائی، چنانچہ اس کے بعد شافعی مذہب کے اوقاف شافعی قاضی القضاۃ کی نگرانی میں اور حنفی مذہب کے اوقاف حنفی قاضی القضاۃ کی تولیت میں آگئے، [2]

بعض وقف کرنے والے اپنے اوقاف کے لئے بعض دوسری شرط لگا دیتے تھے، جیسے مصر کے مدرسۂ خروبیہ کے بانی بدرالدین محمد بن محمد خروبی نے اس مدرسہ کے وقف میں یہ شرط لگائی تھی، کہ اس سے کوئی وظیفہ بجز عرب کے کسی عجمی کو نہ دیا جائے، [3]

اسلامی حکومتیں واقف کے شرائط کی پابندی بڑی احتیاط کیساتھ کرتی تھیں،

بعض اوقاف صرف کار خیر کے نام سے کئے جاتے تھے، ان سے بھی علمار کے وظیفے جاری کئے جاتے تھے، کہ وہ شہروں اور دیہاتوں میں رہ کر شرعی علوم کی اشاعت کی خدمت فراغ بالی سے انجام دیں،

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۷۰۶، [2] الدرالکامنہ جلد ۳ ص ۱۵۵ ترجمہ سراج ہندی [3] خطط مصر جلد ۲ ص ۳۷۹،

اسی طرح "زوایا" "خانات" "رباط" اور "خوانک" وغیرہ کے ناموں سے عمارتیں بنا کر ان پر وقف کئے جاتے تھے، اور ان میں مذہبی جماعتیں مقیم رہ کر علم دین کی خدمت میں مصروف رہتی تھیں، مقریزی نے ایسی بہت سی عمارتوں کا تذکرہ کیا ہے،

دارالاقامہ جس زمانہ تک مدرسوں کے لئے مستقل عمارتیں تعمیر نہیں ہوئی تھیں، نادارس کے انہی مسجدوں کے حجروں اور استادوں کے مکانوں میں رہتے تھے، جب درس گاہ کے لئے عمارتیں تیار ہوئیں، تو ان کے پہلو بہ پہلو دوسری عمارتیں بنائی گئیں، جن میں طلبہ ٹھہرائے گئے، نیز بعض اوقات "حوانیت" "زوایا" "رباط" "خانات" "بیوت" اور "رواق" وغیرہ سے موسوم عمارتیں بھی طالب علموں کے قیام گاہ کے کام آتی تھیں، اور بعض جگہ تعلیمگاہ کی عمارت اس طرز سے بنائی جاتی تھی، کہ اس میں طالب علموں کے قیام کے لئے بھی جگہیں نکل سکیں،

ان اقامت گاہوں میں طالب علموں کے کھانے پینے، پہننے اور زندگی اور تعلیم کی دوسری ضرورتوں کی کفالت کیجاتی تھی، مدرسہ مستنصریہ بغداد کے دارالاقامہ کے حالات میں مولینا شبلی مرحوم یہ بیان فرما چکے ہیں کہ

"مدرسہ ہی کے احاطہ میں ایک ہسپتال اور مزبلہ بھی تھا، (جس سے گرمیوں میں پانی ٹھنڈا کرتے تھے) دو سو اڑتالیس مستعد طلبہ مدرسہ کھلنے کے ساتھ بورڈنگ میں داخل ہوئے، جن کو مکان، فرش، خوراک، روغن، کاغذ، قلم وغیرہ مدرسہ کی طرف سے ملتا تھا، ان کے دسترخوان پر معمولی کھانے کے علاوہ شیرنی اور میوے بھی چنے جاتے تھے، ان سب کے علاوہ ایک اشرفی ماہوار الگ وظیفہ کے طور پر مقرر تھی۔"[1]

ابن بطوطہ نے واسط کے ایک مدرسہ کا حال لکھا ہے، جسے ایک عالم دین شیخ تقی الدین نے اپنے ذاتی مصارف سے قائم کیا تھا، اور اس میں وہ اور ان کے بھائی، اور ان کے شاگرد علماء درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے وہ لکھتا ہے، :-

یہاں (واسط میں) ایک پر رونق عظیم الشان مدرسہ ہے، جس میں تقریباً تین سو حجرے ہیں جنیں

---

[1] مقالات شبلی جلد ۳ ص ۴۶،

پردیسی لڑکے قرآن مجید کی تعلیم کے لئے اکر ٹھہرتے ہیں .... اور انھیں روزانہ کے اخراجات خورد و نوش اور سالانہ پوشاک دیجاتی ہے۔[ل۱]

اسی طرح ابن بطوطہ نے ایک دوسرے شہر تستر کے عالم دین شیخ شرف الدین موسیٰ بن صدر الدین سلیمان کے اوصاف بیان کرکے ان کے ایک مدرسہ کا حال یہ لکھا ہے:۔

اور ان کا ایک مدرسہ اور زاویہ ہے جس میں چار نوجوان خدام سنبل، کافور، جوہر اور مسرور انتظام کے لئے مقرر ہیں، ان میں سے ایک زاویہ کے اوقاف کا نگہبان ہے، دوسرا روزانہ کے اخراجات کو دیکھتا ہے تیسرا یہاں کے آنے والوں کی مہمان نوازی کی خدمت انجام دیتا ہے، اور چوتھا باورچیوں، بہشتیوں اور جاروب کشوں کے کاموں کی نگرانی کرتا ہے۔

میں یہاں سولہ دن تک مقیم رہا، اور یہ دیکھکر مجھے بڑی حیرت ہوئی، کہ یہاں کے روزانہ کے کھانے نہایت نفیس اور قیمتی ہوتے ہیں، روزانہ چار قسم کے کھانے دسترخوان پر رکھے جاتے ہیں، مرغ روٹی، پلاؤ، اور قورمہ، اور پھر مٹھائی کی تشتری علاوہ چنی جاتی ہے۔[ل۲]

ہندوستان کے اسلامی مدرسوں میں دار الاقامے

ہندوستان کے اسلامی مدرسوں میں بھی دار الاقامے قائم تھے، جن میں طالب علموں کے قیام و طعام کا معقول انتظام تھا،

ابن بطوطہ ۷۳۴ھ میں ہندوستان آیا تھا، وہ سندھ کے مقام سیوستان میں ایک بڑے مدرسہ میں اترنے کا تذکرہ کرتا ہے، یہ گرمیوں کا زمانہ تھا، ابن بطوطہ رات کے وقت اس مدرسہ کی چھت پر سوتا تھا،[ل۳]

دلی کے مدرسہ فیروز شاہی کے متعلق ضیاء الدین برنی لکھتا ہے:۔

"وہر روز بیش ہر طائفہ ظیفہ مائدہ نعمت می کشند وچہ مستعدان و متعلمان و حافظان و مصلیان و ذاکران و مشغولان وچہ سایر بندگان خدا مدرسہ فیروز شاہی را اختیار کردہ و راحت ہا و اسائش ہا می گیرند"[ل۴]

ل۱ رحلۂ ابن بطوطہ جلد ۱ ص ۱۲۵ ل۲ رجلد ۱ ص ۱۴۱ ل۳ رجلد ۲ ص ۶ ل۴ تاریخ فیروز شاہی ص ۵۶۴،

فیروز شاہ کے عہد کے ایک شاعر مطہر کڑوی نے جو صاحبِ درس بھی تھا، ایک قصیدہ میں اس مدرسہ کے مفصل حالات قلمبند کئے ہیں، اس کے دار الاقامہ کے دستر خوان کے الوانِ نعمت کا ذکر یوں کرتا ہے:۔

همه دراج و کبوتر بچه و کبک و کلنگ ماهی و مرغ مسمّن بره کوه و قار

ناردان نوشکر و لوز و حوائج (فوایح) ورثی زعفران صندل و مشک (و) همه بر (گونه) فرزار

قرص بریان زلیبا و دگر آرایش (کذا) خشت (و) لوزینه تر و خشک بهر سو انبار

راست گوئی که بیاراست بهارے ز نعیم صحنها برگ صفت کاسه درو نرگس وار

واندران (و آبداران) همه بر دست قدحها جلّه کروه با شربت حماض شراب انار

چون بپرداخت زمان محفل از شرب و نوش سفره برداشته شد دست کشیدند اخیار

برگ واران شده ورد ان تنبول و دان برگے ان ها ئے زر و سیم گرفته یک بار

بیرها (بیڑہ) چون گل صد برگ چو ...... گل دوخته آن گل صد برگ بیک سوزن (سوزن) خار

زعفران انگ (رنگ) و نعد (کذا) فره و عنبر بوی حرب پهلو و تر اندام و سقط (کذا) رخسار[۵۱]

عادل شاہ نے شاہی مدرسہ کے لڑکوں کے دار الاقامہ کا اہتمام کیا تھا، اور انھیں روزانہ کھانا دیا جاتا تھا، پڑھنے کے لئے کتابیں مہیا کی جاتی تھیں، اور نقد وظیفہ جاری تھا، بساتین السلاطین میں ہے:۔

"شاگردان را از سفرہ آتا و آتش نان بوقت صبح بریانی و مزعفر و بوقت شام گندم و کھچڑی فی اسم یک ہون بدون این کتاب ہاے عربی و فارسی امداد نمایند"[۵۲]

وظیفے ہندوستان کے مدرسوں میں،

جس طرح دوسرے اسلامی ملکوں میں طالب علموں کو وظیفے دیئے جاتے تھے، ویسے ہی ہندوستان کے مدرسوں میں بھی وظیفے جاری تھے، جیسے فیروز شاہ کے متعلق ہے:۔

"و وظائفے کہ از طالبان علم محتاج وہ تنکہ بودند صدگان و دویستگان و سیصدگان تنکہ ادرار معین گشت

[۵۱] رسالہ اورینٹل کالج میگزین مئی ۳۵ء ۱۳۸ [۵۲] بساتین السلاطین ص ۳۵۱،

وعلما و متعلمان شہر از خرد و بزرگ بانعمت و ثروت شدند[1]

مطہر کڑوی لکھتا ہے:۔

هر جا که اهل دانش و اصحاب و زهد بود   نان داد و دیر داد و درهما نثار کرد،

پیران کهنه سال و یتیمان خورد را،   چندان وظیفه داد که صاحب یسار کرد[2]

اسی طرح ہندوستان میں مختلف فرمانروا خاندانوں کے سلاطین نے اپنے اپنے زمانہ میں وظیفے مقرر کئے،

عالمگیر نے ہر صوبہ میں یہ احکام جاری کر دیئے تھے، کہ ہر صوبہ کے طالب علموں اور استادوں کے وظیفے اور تنخواہیں اسی صوبہ سے ادا کی جائیں، اور استادوں سے سیاہہ کی مہریں لیکر اس صوبہ کے خزانچی کے پاس جمع کر دیجائیں[3]

اساتذہ کا قیام دارالاقامہ میں اور ان کے قیام کے آداب،

ان عمارتوں میں اساتذہ بھی قیام کرتے تھے، اور طلبہ کی راحت رسانی اور تعلیمی ضرورتوں کی نگرانی کرتے، اور ان کی اخلاقی اور دینی تعلیم و تربیت پر وقت صرف کرتے تھے، نیز اپنے بہترین اسوۂ عمل سے لڑکوں کے لئے نمونہ بنتے تھے، اور بعض اوقات مدرسوں، زاویوں اور مسجدوں کی عمارتوں اور ان کے وقف اور وظیفوں کی نگہبانی کرتے تھے،

اساتذہ و علما، عموماً دارالاقامہ کی نیچے کی منزل میں رہتے تھے، اور لڑکے اوپر کی منزلوں میں رکھے جاتے تھے، کیونکہ اولاً علما، کو ان کی سن رسیدگی کی وجہ سے اوپر چڑھنے اترنے میں زحمت ہوتی، اس کے علاوہ ان کا تعلق رشد و ہدایت اور فتووں کی وجہ سے شہر کے عوام سے بھی رہتا تھا، اس لئے مسئلے مسائل پوچھنے کے لئے نیچے کی منزل میں بآسانی پہونچ سکتے تھے،

مدرسہ اور دارالاقامہ میں جو اساتذہ قیام کرتے تھے، وہ لڑکوں کی نگاہوں میں اپنا وقار قائم رکھتے تھے، اور ایسی زندگی رکھتے، کہ ایک طرف لڑکوں کے دلوں میں ان کا احترام قائم رہے، دوسری طرف ان سے لڑکوں کو علمی اور تعلیمی فائدے پہونچتے رہیں، مثلاً

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۵۹، [2] اورنٹیل کالج میگزین سنہ ۳۵ مئی ۱۳۲،۱۳۱، [3] سیر المتاخرین جلد ا ص ۱۴۰ و مرأت احمدی جلد ا ص ۲۶۲

۱- وہ بلا ضرورت اپنی اقامتگاہ سے باہر نہ نکلتے، کیونکہ بار بار سامنے آنے اور چلتے پھرتے دکھائی دینے سے لوگوں کی نگاہوں میں احترام قائم نہیں رہتا ہے،

۲- نماز التزام کیساتھ باجماعت مسجد میں پڑھتے تھے، تاکہ لڑکوں کے دلوں میں ان کی مذہبی پابندی میں سستی کرنے کا خیال نہ آئے، اور لڑکے بھی پیروی کرکے نماز باجماعت کے پابند رہیں،

۳- شرعی احکام اور جزئی مباح اور مستحب کے مسئلوں پر پابندی سے عمل کرتے تھے، اور اخلاق و معاشرت کے عام اصولوں کے پابند رہتے تھے،

۴- اساتذہ لڑکوں کے لئے درس کے وقتوں کے علاوہ کوئی علیحدہ وقت بھی مقرر کر دیتے تھے، جس میں وہ لوگ ان کے پاس آکر اپنے علمی اور تعلیمی شکوک دور کرتے تھے، مطالعہ کی کتابوں کے مشکل مقاموں میں ان سے استفادہ لیتے تھے، اور کتابوں کے نسخوں کی تصحیح، مشکل الفاظ و اسمار کے حروف کے ضبط، ثقیل لغتوں کی تشریح، اور کتابوں کے نسخوں کے اختلاف کی تحقیق میں ان سے مدد لیتے تھے[۱]، بلکہ بعض خاص صورتوں میں رات کے خالی وقتوں میں بھی شوقین لڑکوں کو پڑھاتے تھے، قاضی اسد بن فرات امام محمد کے حلقۂ درس میں شریک تھے، ان کی استدعا پر امام محمد نے انھیں بڑی شفقت سے رات کے وقت پڑھانا منظور کیا تھا، قاضی اسد خود کہتے ہیں کہ

"میں نے محمد بن حسن سے کہا کہ میں پردیسی ہوں اور آپ سے فقہ و حدیث کا بہت کم سرمایہ جمع کرسکا ہوں کیونکہ آپکے شاگردوں کی تعداد زیادہ ہے اسلئے میرے لئے کیا خاص رعایت ہو سکتی ہے؟ انھوں نے فرمایا، کہ عراقی لڑکوں کے ساتھ دن کے وقت درس میں شریک رہو اور رات کا وقت صرف تمھارے لئے خاص کرتا ہوں، رات کو میرے ہی پاس رہو میں تمھیں حدیثیں سنایا کروں گا"۔

چنانچہ میں شب کو امام محمد کے یہاں رہنے لگا، وہ خود کوٹھے پر رہتے تھے، اور میں نیچے کی منزل میں رہتا تھا لیکن میری خاطر سے وہ نیچے ہی اتر آئے، اور درس کے لئے اپنے سامنے ایک پیالہ میں پانی رکھ کر بیٹھ جاتے، جب پڑھتے پڑھتے رات زیادہ گذر جاتی تو مجھے نیند آنے لگتی، وہ مجھے اونگھتے ہوئے دیکھ کر ایک چلو پانی میرے منہ پر چھڑکتے، اور میں بیدار ہو جاتا، ان کا اور میرا یہی طریقہ بدستور جاری رہا، یہاں تک کہ میں جس قدر ان سے پڑھنا چاہتا تھا، پڑھ لیا"[۲]

---

[۱] تذکرۃ السامع ص ۲۰۲، تا ۲۰۴، [۲] تاریخ صقلیہ جلد ۲ ص ۲۴۵، ۲۴۶،

دارالاقامہ میں طلبہ کی کثرت

کبھی کبھی دارالاقاموں میں لڑکوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہو جاتی تھی کہ مجبوراً ایک ایک کمرے میں دو دو اور تین تین لڑکوں کو ٹھہرانا پڑتا تھا[51] آٹھویں صدی میں جامع ازہر مصر کے دارالاقامہ میں ۷۵۰ لڑکے رہتے تھے[52]

دارالاقامہ کے چند قواعد

قاضی ابن جماعہ نے طلبہ کو جو آداب سکھائے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں دارالاقامہ میں طلبہ کے لئے کس قسم کے آئین و آداب رائج تھے

مثلاً چند آداب یہ ہیں:-

۱- کمسن بچے کسی ولی کے بغیر دارالاقامہ میں نہ رکھے جاتے تھے،

۲- لڑکوں پر دارالاقامہ سے باہر جانے میں پابندیاں عائد تھیں خصوصاً مشتبہ مقاموں میں جانے کی اجازت نہ تھی محلوں کے لئے بھی ایسے مقاموں سے گذرنا احتراز کے قابل سمجھا جاتا تھا،

۳- اور نہ دارالاقامہ میں ایسے شہریوں کو آنے دینے کی اجازت تھی، جو تہذیب اور اخلاق میں لوگوں کی نگاہ سے گرے ہوتے تھے،

۴- استادوں، لڑکوں، اور ملازموں کے علاوہ کسی ایسے شخص کو مدرسہ میں ٹھہرنے کی اجازت نہ تھی جسکا مدرسہ سے کوئی تعلق نہ ہو،

۵- شریعت کے احکام کی پابندی سختی سے کرائی جاتی تھی،

۶- لڑکوں کے باہمی ملنے جلنے کے آداب اور استادوں سے ملنے جلنے میں ادب اور احترام کے آئین کی پابندی کرائی جاتی تھی،

---

[51] خطط مصر جلد ۲ ص ۳۷۱،

[52] خطط مصر جلد ۲ ص ۳۷۱،

دارالاقامہ کے طلبہ کو چند آداب وتہذیب کی تلقین

قاضی ابن جماعہ نے دارالاقامہ میں رہنے والے لڑکوں کو چند تعلیمی، معاشرتی، اخلاقی اور اجتماعی آداب اور تہذیب کی تلقین کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اس زمانہ میں لڑکے بورڈنگوں میں کس طور طریق سے رہتے سہتے تھے، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں:۔

۱۔ مدرسے اور ان کے اوقاف نہ صرف سکونت اور عیش وآرام کے لئے قائم کئے گئے ہیں اور نہ خانقاہوں کی طرح محض نماز روزہ کی عبادتوں کے لئے ہیں، بلکہ وہ اس لئے ہیں کہ علم کی تحصیل میں مدد پہنچائیں، لڑکوں کی زندگی کے یہ دن جو مدرسوں اور دارالاقاموں میں بسر ہوتے ہیں، بڑے بیش قیمت ہیں، انھیں ایک لمحہ کے لئے ضائع نہ کرنا چاہیئے، اور ان کو ان کے حقیقی اور صحیح مشغلوں میں صرف کرنے پر سب سے زیادہ نگاہ رکھنی چاہیئے،

۲۔ ہر طالب علم کا فرض ہے، کہ وہ مدرسہ اور دارالاقامہ میں علم اور تعلیم میں لگے رہنے والوں سے ربط وضبط رکھے اور ان سے مفید علمی خدمات کا ذخیرہ بڑھاتا رہے،

۳۔ دارالاقامہ میں تفریح ودلچسپی، اور خوش گپی کی جو صحبتیں قائم ہو جاتی ہیں، ان سے علٰحدہ رہکر تحصیل علم میں مصروف رہے،

۴۔ مدرسہ کے سبقوں اور مذاکروں کی مجلسوں میں پابندی سے شریک رہنا چاہیئے، اگر دارالاقامہ میں رہنے والے لڑکے ہی درس اور مذاکرہ کی مجلسوں سے غیر حاضر رہیں گے تو مدرسہ اور دارالاقامہ کے قائم کرنے کا اصل مقصود فوت ہو جائے گا،

۵۔ مجلسوں اور حلقوں کے معلوم ومتعین وقتوں میں اپنی قیام گاہ کو نہ چھوڑنا چاہیئے، اور نہ مجلسوں سے اٹھ کر بار بار اپنے کمرے میں آنا چاہیئے، اور نہ ان وقتوں میں باہر کے کسی شخص کو اپنے یہاں مدعو کرنا چاہیئے،

۶۔ رفتار، گفتار، نشست برخاست، اور گفتگو میں آداب وتہذیب ملحوظ رکھے جائیں، چال میں میانہ روی رکھنی چاہیئے، پڑھنے اور تکرار کرنے اور بحث اور مباحثہ کرنے میں آواز پست رکھی جائے، اور دروازہ کھولنے

اور بند کرنے میں یہ احتیاط رکھی جائے کہ زور کی آواز نہ پیدا ہونے پائے، یہ تمام باتیں تہذیب کے خلاف ہیں

۷۔ درس کے وقتوں میں کسی مدرس کے حلقہ کے سامنے سے گذرنا نہ چاہئے، تاکہ درس و تدریس میں خلل اندازی نہ ہو،

۸۔ دارالاقامہ کے دوسرے لڑکوں کو سلام کرنے میں پیشقدمی کرنا چاہئے، ان کی ہمسایگی، ہم جنسی، ہم صحبتی، دینی برادری، اور ہم پیشگی کا لحاظ کرکے ان سے مناسب سلوک کرنا چاہئے، ان کی برائیوں سے بچنا، ان کی لغزشوں کو معاف کرنا، ان کے عیوب کو چھپانا، انکے ناروا سلوک سے چشم پوشی کرنا، اور ان میں سے احسان کرنیوالوں کا شکریہ ادا کرنا چاہئے،

۹۔ اگر مدرسہ یا دارالاقامہ میں کسی کی بدخلقی اور بدطینتی کی وجہ سے رنج پہنچے، تو تھوڑی دیر کے لئے اس جگہ سے علیحدہ ہوکر طبیعت میں سکون پیدا کرنا چاہئے، اور اگر پھر تعلقات میں ہمواری پیدا ہوکر حالات سدھر جائیں، تو اس مدرسہ سے منتقل نہ ہونا چاہئے، کیونکہ مدرسہ کو بار بار بدلنا خصوصاً مبتدیوں کے حق میں اچھا نہیں ہوتا ہے،

۱۰۔ جب مدرسہ کے حجرے میں کسی جگہ سے گذرنا پڑے، تو یہ احتیاط رکھنی چاہئے، کہ جوتوں میں سے کوئی چیز چھوٹ کر فرش یا چٹائی پر گرنے نہ پائے، اور نہ جوتے اس طرح ہاتھ میں اٹھائے جائیں، کہ دونوں جوتوں کے تلے باہم ملجائیں، بلکہ دونوں جوتوں کے اوپر کے رخ کو ایک دوسرے سے ملاکر رکھنا چاہئے، اور جوتے کسی علیحدہ مقام پر رکھے جائیں لیکن مسجد کی چٹائی کے نیچے اس طریقہ سے نہ رکھے جائیں، کہ چٹائی کے ٹوٹنے کا اندیشہ ہو،

۱۱۔ اوپر کی منزل میں رہنے والوں کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ آہستہ آہستہ چلیں تاکہ تیز چلنے کی وجہ سے نیچے کی منزل والوں کو تکلیف نہ پہونچے،

۱۲۔ زینہ سے اترنے میں اگر دو آدمی ساتھ ہوجائیں تو ان میں سے چھوٹے کا فرض ہے کہ وہ جلد جلد اتر کر راستہ صاف کردے، اور جو اوپر رہ گیا ہو اسکی تہذیب کا تقاضا یہ ہوگا، کہ وہ اپنی جگہ اسی سیڑھی پر کھڑا رہے جب پہلا اترنے والا نیچے اتر جائے تو وہ اترنا شروع کرے،

اور اگر نیچے کی سیڑھی پر اوپر جانے کے لئے دو آدمی اکٹھے ہو جائیں، تو چھوٹے کو چاہئے کہ وہ زینہ سے نیچے اتر آئے، اور جب اس سے بڑی عمر کا چڑھنے والا اوپر چڑھ جائے، تو پھر وہ اوپر چڑھے،

۱۳- مدرسہ کے دروازہ یا دہلیز پر بیٹھنا نہ چاہئے، اور نہ کسی راستہ کو گھیر کر کھڑا ہونا چاہئے، تاکہ آنے جانیوالوں کو زحمت پیش آئے،

۱۴- مدرسہ کے صحن میں بلا ضرورت صرف تفریح یا ورزش یا کسی کے انتظار میں چہل قدمی نہ کرنا چاہئے چلنے پھرنے کا سلسلہ امکان بھر کم رکھنا چاہئے،

۱۵- لڑکوں کے لئے جو وضو خانے بنے ہوتے ہیں، ان میں گھس پل کر جلدی وضو کرنے کی کوشش نہ کرنا چاہئے، اس سے ابتذال ٹپکتا ہے، وضو کے مقام کے خالی ہونے کا انتظار کرنا چاہئے، اور اگر دروازہ بند ہو تو تین مرتبہ کھٹکھٹا کر آہستہ سے کھولنا چاہئے،

۱۶- مدرسہ اور دار الاقامہ کی دیواروں پر تپھر یا کوئلہ سے نشان نہ بنانا چاہئے، اس سے دیوار خراب ہوتی ہے، اور نہ گندے ہاتھ دیواروں میں پونچھنے چاہئیں، اس سے دیوار گندی ہوتی ہے،

۱۷- راہ میں گذرتے ہوئے دروازوں کی درازوں اور جھانکوں پر نظر نہ جانی چاہئے کہ اندر کی چیزیں دکھائی دیں، اور اگر دروازہ کھلا ہو، تو ادھر سے نگاہ پھیر لینی چاہئے، اور اگر اندر سے سلام کی آواز آئے، تو جواب دے کر گذر جانا چاہئے،

۱۸- بلند آواز نہ نکالنی چاہئے، نہ پڑھنے میں اور نہ کسی کو پکارنے میں تاکہ دوسرے کو تکلیف نہ ہو خصوصاً نمازیوں کے نماز پڑھتے وقت، اور درس کے حلقوں میں بہت آہستہ بولنا چاہئے، اسی طرح تکرار، مذاکرہ، بحث اور مباحثہ کے موقع پر،

۱۹- اگر مدرسہ جانے کا راستہ کسی کھلی راہ سے ہو تو پورے کپڑے پہن کر جانا چاہئے خاص طور پر سر ننگا نہ رہے

۲۰- بری عادتوں جیسے راہ چلتے دیکھنا، زور دار قہقہے مارنا، ہر وقت ہزلیات بکتے رہنا، پہلو پر یا چت

لیٹے رہنا، اونگھنا، یا بے وقت سونا، ان سب سے پرہیز کرنا چاہیے،[۱]

مدارس کے کتب خانے مدرسوں میں منتظمین کی طرف سے کتب خانے قائم کئے جاتے تھے جن سے علماء اور طلبہ استفادہ کرتے تھے، جب بغداد میں مدرسہ مستنصریہ قائم ہوا، تو شاہی کتب خانہ سے ایک سو ساٹھ اونٹوں پر لاد کر چیدہ کتابیں مدرسہ کی عمارت میں منتقل کی گئیں،[۲] اسی طرح الحاکم نے مصر میں دار الحکمۃ کے نام سے ایک دار العلم کھولا تو اس میں وسیع پیمانہ پر کتب خانہ بھی قائم کیا، مقریزی لکھتا ہے:-

"اس دار العلم میں امیر المومنین کے خزانہ سے مختلف فنون اور آداب کی کتابوں کا ایسا ذخیرہ جمع کیا گیا جس کی مثال آج تک نہیں دیکھی گئی"۔

"یہاں ہر شخص کو اگر فائدہ اٹھانے کی عام اجازت دیدی گئی تھی،...... بعض لوگ یہاں کتابوں کے مطالعہ کیلئے آتے، بعض انھیں نقل کرنے کے لئے اور بعض سبق پڑھنے کے لئے کتابیں لیتے تھے،

اس میں لکھنے پڑھنے کی عام ضرورت کی چیزیں، روشنائی، قلم، دوات اور کاغذ بھی لوگوں کے لئے تیار رکھی جاتی تھیں"۔[۳]

اسی طرح دوسرے مدرسوں میں کتب خانوں کے وجود کا پتہ چلتا ہے، جیسے مدرسہ ناصریہ مصر کے متعلق ہے:-

"اس میں اس نے ایک جلیل القدر کتب خانہ قائم کیا"[۴]

مدارس کے شفاخانے مدرسون کے لئے اسی کی عمارت کے اندر جداگانہ شفاخانے بھی قائم کئے جاتے تھے جن میں مدرسہ کے متوسلین علاج ومعالجہ کراتے تھے، مدرسہ مستنصریہ کے سلسلۂ عمارات میں اس کے شفاخانہ کے لئے علیحدہ عمارت تعمیر کی گئی تھی،[۵]

---

[۱] تذکرۃ السامع ازص ۲۰۹ تا ص ۲۳۶ [۲] مقالات شبلی جلد ۳ ص ۲۶ ، [۳] خطط مصر مقریزی جلد اص ۴۵۹ [۴] ،، جلد ۲ ص ۳۸۲

[۵] مقالات شبلی جلد ۳ ص ۲۶ ،

ایوانِ درس مدرسوں میں درس کے لئے علٰحدہ علٰحدہ ایوان (ہال) تعمیر کئے جاتے تھے جنھیں موجودہ زمانہ کا کلاس روم کہا جاسکتا ہے، لیکن ان کی تقسیم درجوں کے اعتبار سے نہ تھی، بلکہ ہر استاد کے لئے درس کا ایوان علٰحدہ ہوتا تھا۔ کبھی ایوانِ درس کی دیواروں پر زینت کے لئے اشعار لکھتے تھے۔[1]

مقاماتِ تدریس درس کے ہر ایوان میں استاد کے لئے مقامِ تدریس علٰحدہ بنایا جاتا تھا، ابن بطوطہ بغداد کے مشہور مدرسہ مستنصریہ کے متعلق لکھتا ہے:-

"اس مدرسہ میں چاروں مذہبوں کی تعلیم دیجاتی ہے، ہر مذہب کے لئے مسجد (مدرسہ) میں ایک ایک ایوان اور مقامِ تدریس ہے، مدرس کی نشست لکڑی کے ایک چھوٹے قبہ کے اندر کرسی پر جس پر فرش بچھا ہوتا ہے، ہوتی ہے"[2]

مدرسوں کے عہدہ دار و ملازمین اسلامی مدرسوں میں حسب ذیل عہدہ دار و ملازمین کا پتہ چل سکا ہے:

۱۔ صدر اساتذہ

۲۔ مرتب مدرسہ

۳۔ اساتذہ

۴۔ معید

۵۔ نقیب

۶۔ خازن

۷۔ دربان

صدر اساتذہ مدرسوں میں اساتذہ و معلمین کے درمیان فرق مراتب قائم تھا، ہر مدرسہ میں رئیسِ معلّم کے لقب سے ایک صدر اساتذہ ہوتا تھا، جو معلمین کا افسرِ اعلیٰ ہوتا تھا، ابو اسحٰق شیرازی نظامیہ کے پہلے صدر مدرس تھے، اور سلسلی کے بعض صدر اساتذہ کا ذکر تاریخ میں آیا ہے۔[3]

---

[1] وفیات الاعیان جلد ا ص ۳۷ہ، [2] رحلۃ ابنِ بطوطہ جلد ا ص ۱۶۷، [3] مختصر کتاب انباء الرواۃ علی انباء النحاۃ درامارى ص ۶۴۸

مرتب مدرسہ، مدرسوں میں مرتب مدرسہ کے لقب سے ایک عہدہ دار ہوتا تھا، جسے شاید موجودہ زمانہ کے مدرسوں کا مہتمم سمجھنا چاہیے، مدرسہ کے انتظامی امور اور نظم ونسق کے مسائل اس سے متعلق رہتے تھے، جیسے شیخ محمد ابن محمد بن احمد معروف بہ ہمام مرتب حریوی متوفی ۶۱۱ھ بغداد کے مدرسہ نظامیہ کے مرتب تھے[۱]،

شیوخ و اساتذہ ہر مدرسہ میں مختلف علوم و فنون، قرآن، حدیث، تفسیر، کلام، فلسفہ، صرف و نحو وغیرہ کے لئے علیحدہ علیحدہ معلم ہوتے تھے جنھیں شیخ کا لقب حاصل ہوتا تھا، وہ اپنے شعبۂ علم کا نگراں ہوتا تھا، اور اس کے ماتحت اس کے نائبین ہوتے تھے،

اساتذہ کا لباس، اساتذہ کا لباس خاص ہوتا تھا، مدرسہ مستنصریہ کے اساتذہ عمامہ باندھتے اور سیاہ عبا پہنتے تھے، درس کے وقت انکے لئے اس لباس میں ملبوس رہنا ضروری تھا، ابن بطوطہ لکھتا ہے،

"مدرس اس (مقام تدریس) پر عمامہ باندھے ہوئے سیاہ لباس پہن کر بیٹھتا ہے اس سے ایک خاص وقار اور تمکنت ظاہر ہوتا ہے"[۲]،

اساتذہ کا انتخاب اساتذہ کا انتخاب بڑی دیکھ بھال سے کیا جاتا تھا، ملک کے مشہور ارباب فضل ڈھونڈ ڈھونڈ کر بلائے جاتے تھے، اور علم و دین کی خدمت کے تخیل کے ساتھ وہ اپنے فرائض انجام دیتے تھے، مدرسہ کے بانی اگر کسی غیر معمولی صاحب فضل و کمال کو کسی گاؤں میں گوشہ نشین پاتے، تو اسے کھینچ کر مدرسہ میں بلا لیتے، مدرسہ نظامیہ کا بانی نظام الملک طوسی کسی ضرورت سے بلخ گیا ہوا تھا، وہاں اسے ایک گاؤں وخش میں ایک صاحب کمال کے عزلت گزین ہونے کی اطلاع ملی جس نے تحصیل علم میں بڑے بڑے سفر کئے تھے، اور حدیثوں کا قیمتی ذخیرہ سینہ میں محفوظ کر لیا تھا، یہ حافظ امام ابو علی حسن بن علی وخشی تھے، نظام الملک ان کے حالات سنکر ان کا مشتاق ہوا، اور انھیں بلا کر مدرسہ نظامیہ میں حدیث کی مشیخت کے عہدہ پر سرفراز کیا، اور سنن ابو داؤد خود ان سے پڑھی[۳]،

---

۱ الوافی بالوفیات صفدی جلد ۱ ص ۱۵۶ ۲ رحلۃ ابن بطوطہ جلد ۱ ص ۱۶۰، ۳ تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۳۴۴، ۳۴۵

اساتذہ کی معاشی حالت جیسا کہ اوپر کہا گیا، حضرت عمر بن عبد العزیز کے زمانہ سے معلموں کے وظیفے مقرر ہونا شروع ہوئے پھر جب مدرسوں کا باقاعدہ نظام جاری ہوا تو ان کی تنخواہیں مقرر ہونے لگیں، مولینا شبلی مرحوم نے انکی بیش قرار تنخواہوں کا تذکرہ اپنے مقالہ میں فرمایا ہے،

لیکن یہ تنخواہیں جس قدر بھی بیش قرار ہوں اس عہد کی عام معاشی فراغ بالی اور ارباب حکومت اور اہل مناصب کی تنخواہوں کے لحاظ سے وہ کم ترتھیں ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں قاضیوں، مفتیوں، خطیبوں اور معلموں کو ایک زمرہ میں شمار کرکے دکھایا ہے کہ یہ لوگ غیر معمولی دولت وثروت حاصل نہیں کر سکتے، وہ لکھتا ہے کہ

"اس کا سبب یہ ہے کہ کسب اعمال کی قیمت ہوتا ہے، اور اعمال کی ضرورتوں کے اختلاف کے لحاظ سے ان کی قیمتوں میں فرق ہوتا ہے جن کاموں کی تمدنی زندگی میں لوگوں کو زیادہ ضرورت ہوتی ہے ان کی قیمت زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ عوام ان کے زیادہ حاجتمند ہوتے ہیں، لیکن ان کاموں یعنی تدریس اور افتاء وغیرہ کے پیشوں کی عام لوگوں کو زیادہ حاجت نہیں، ان کی احتیاج زیادہ تر خواص کو ہوتی ہے، عوام عموماً ان سے مستغنی ہوتے ہیں، حالانکہ اپنی جگہ ان کی ضرورت اور اہمیت شدید ہے اسی لئے حکومت جو معاوضہ کی ذمہ دار ہوتی ہے، وہ ان پیشوں کے فائدوں اور مصلحتوں کا لحاظ کرکے ان صنفوں کا اہتمام خود کرتی ہے، اس لئے ان کی معیشت کے اہتمام کی ذمہ داری بھی حکومت پر عائد ہوتی ہے لیکن وہ (بعض دوسرے اسباب کی بنا پر جن کی تفصیل کسی دوسری جگہ بیان کی گئی ہے) انہیں بڑے عہدہ داروں کے مساوی معیشت مہیا نہیں کرتی ہے، پھر دوسری طرف ان پیشوں کے لوگ اپنے علم اور فضل کی وجہ سے زیادہ خوددار ہوتے ہیں، اس لئے وہ ذلت نفس اٹھاکر رزق کی طلب کے وہ وسائل اختیار نہیں کرتے جنھیں عام لوگ کام میں لاکر معیشت بہم پہنچاتے ہیں اسلئے وہ لوگ عموماً زیادہ دولتمند نہیں ہوتے ہیں"

اس کے بعد لکھتا ہے، :-

"میں نے اپنا یہ نظریہ بعض اربابِ فضل سے بیان کیا تھا، لیکن انھوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا، حسنِ اتفاق کہ مجھے مامون کے دفتروں کے بعض حسابوں کے پھٹے ہوئے اوراق ہاتھ آئے، جو بیت سے آمد و خرچ کے حسابوں پر مشتمل تھے، ان کے مطالعہ سے تعجب انگیز طور پر میرے اوپر کے بیان کی تصدیق ہوئی"[1]

البتہ جو اہلِ علم دوسرے ذرائع سے دولت جمع کر لیتے تھے، اور اپنے ذوق سے خود مدرسے قائم کرتے تھے، ان کی مثال اس سے علیحدہ ہوگی، جیسا کہ ابنِ بطوطہ نے بعض شہروں کے علماء اور فضلاء کی دولتمندی کا تذکرہ کیا ہے، اس کے ماسوا ہر دور میں ایسے اہلِ علم بھی پائے جاتے تھے، جو اپنی پرہیز گاری کی بنا پر تعلیم کی اجرت لینا جائز نہیں سمجھتے تھے، اور معاش کے حاصل کرنے کے لئے کوئی دوسری سبیل نکالتے، اور بقدرِ ضرورت حاصل کر کے گذر اوقات کرتے، اور تعلیم و تعلم میں مشغول رہتے، بلکہ امام غزالی نے احیاء العلوم میں تعلیم کا معاوضہ لینے کی ممانعت کی ہے۔[2]

معید ہر ایوانِ درس میں ایک یا دو "معید" ہوتے تھے، جو استاد کے درس اور املا کا اعادہ کرتے جاتے تھے، ابن بطوطہ اسی سلسلۂ بیان میں کہتا ہے:

"اس (استاد) کے دائیں بائیں دو معید ہوتے ہیں، وہ ہر فقرہ کو جو استاذ لکھاتا ہے، دہراتے جاتے ہیں،

درس کی ان چاروں مجلسوں میں سے ہر مجلس میں بھی ترتیب اور نظام قائم ہے"[3]

معید کی حیثیت لڑکوں سے بلند اور استاذ سے فروتر ہوتی تھی، حوالہ کی کتابوں کا مراجعہ کرنا بھی اسی کا کام تھا، جیسے ابو اسحٰق ابراہیم بن علی بن یوسف شیرازی جو آگے چل کر مدرسہ نظامیہ بغداد کے سب سے پہلے صدر معلم نامزد ہوئے تھے، اپنے استاذ ابو الطیب طبری کے درس کے حلقہ میں معید استاذ اور بعد میں مدرسہ نظامیہ میں صدر معلم مقرر ہوئے۔[4]

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۳۲ و ص ۴۳۳ [2] احیاء العلوم کتاب العلم، [3] رحلۃ ابن بطوطہ جلد ۱ ص ۱۶۷ [4] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۶۵،

معید کے فرائض اور ذاتی اوصاف میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ نیکو کار اور صاحب فضل ہو، اگر کسی وقت لڑکوں کی طرف سے کوئی نا ملائم برتاؤ ظاہر ہو، تو صبر اور ضبط کر سکتا ہو، انھیں فائدہ پہنچانے کا خواہاں ہو، اور انھیں اپنے فرائض کی ادائی پر مستعد رکھ سکتا ہو[1]۔ وہ لڑکوں کے ساتھ دار الاقامہ ہی میں مقیم رہتے، اور انکی تکرار اور مطالعہ میں جب کوئی دقت پیش آئے اور وہ استاذ کے درس اور املا کو بھول گئے ہوں تو اسوقت بھی وہ اس کے ضروری حصے دہرائیں، بلکہ قاضی ابن جماعہ کا بیان ہے کہ معید کا نام "معید" اسی موقع کی مناسبت سے پڑا ہے، کہ وہ خارج وقتوں میں درس کا اعادہ کرتا ہے[2]۔

معید کا منصب دسویں صدی ہجری تک مدرسوں میں باقی تھا، صاحب الشقائق النعمانیہ، مصلح الدین مصطفیٰ معروف بابن البرکی زادہ متوفی ۹۱۹ھ کے متعلق لکھتا ہے:۔

"یہ بعض قاضیوں کی اولاد میں سے تھے، اپنے زمانہ کے مشہور علماء سے تعلیم حاصل کی، پھر مولیٰ قاسم معروف بہ قاضی زادہ کی خدمت سے وابستہ ہوئے، پھر ان کے درس کے حلقہ کے **معید** قرار پائے، اس کے بعد بعض مدرسوں میں استاذ مقرر ہوئے، پھر سلطان بایزید نے انھیں اپنے لڑکے سلطان احمد کا معلم بنایا، اسکے بعد سلطنت کے آٹھ مدرسوں میں سے ایک مدرسہ ان کے سپرد کیا گیا"[3]۔

نقیب درس

درس کے ہر ایوان میں ایک نقیب ہوتا تھا، اس کے لئے ذہین اور موقع شناس ہونا ضروری تھا، وہ مجلس کی مناسب ترتیب قائم رکھتا، حاضرین کو ان کے مرتبہ کے مطابق بٹھاتا، لڑکوں کو مجلس کے آداب کے برقرار رکھنے اور درس کو توجہ سے سننے اور مجلس کے حاضرین کو خاموش رہنے کی تلقین کرتا، غرض وہی مجلس کے جملہ انتظام و انصرام کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا[4]۔

قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں:۔

ہر حلقہ کے استاد کے لئے ایک نقیب ضروری ہے، جو ہشیار، تیز اور جری ہو، حاضرین میں ترتیب قائم کر سکے، اور جو لوگ حلقہ میں آئیں، انھیں ان کے مرتبہ کے مطابق بٹھائے، سونے والوں کو بیدار کرے،

[1] تذکرۃ السامع ص ۲۰۱ [2] ص ۲۰۴ [3] الشقائق النعمانیہ حاشیہ وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۳۶۴ [4] تذکرۃ السامع ص ۱۴۱

طالب علموں کو جو کچھ کرنا ہے، اس کے نہ کرنے پر، اور جو نہ کرنا چاہیے اس کے کرنے پر تنبیہ و اشارہ کرے، اور سبقوں کے سننے کی ہدایت کرے، اور سبق کے درمیان خاموشی قائم رکھے۔[۱]

خازن اسکی نگرانی میں مدرسہ کا کتب خانہ ہوتا تھا،

دربان اگرچہ درس کے ایوان کا دروازہ ہر صاحب علم و طالب علم کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا، تاہم مدرسوں کی دہلیز پر دربان مقرر رہتے تھے، جو درس و تدریس کے وقتوں میں مدرسہ میں آنے جانے والوں پر نگاہ رکھتے تھے، اور غیر متعلق اور ضروری اشخاص کو اندر جانے سے روکتے تھے،[۲]

بچوں کے آغاز تعلیم کی عمر اس زمانہ میں بڑی کم عمری کے زمانہ میں بچوں کی تعلیم شروع کرا دیتے تھے، ہندوستان میں ۴ سال ۴ مہینے اور ۴ دن کی عمر میں بچوں کے مکتب کرنے کا جو رواج ہے، اس کا پتہ مغل سلاطین کے عہد سے چلتا ہے، چنانچہ بابر نے ہمایوں کا مکتب اسی عمر چار سال چار مہینے اور چار روز میں کرایا،[۳] پھر ہمایوں نے اپنے لڑکے اکبر کو بھی اسی عمر میں مکتب کے لئے بٹھایا، اکبر نامہ میں ہے:۔

"از ہفتم شوال ایں سال کہ از عمر ابد پیوند حضرت شہنشاہی چہار سال و چہار ماہ و چہار روز شدہ بود، بآئین رسم و عادات آں آموختہ درس گاہ الٰہی و رموز دان دبستان ربانی را در مکتب بشری در آوردند"[۴]

اگرچہ اس تعیین و تحدید کا ذکر عربی و اسلامی ملکوں کے علما کی طالب علمی کے حالات میں نظر نہیں آیا، مگر ان ملکوں میں بھی اپنے بچوں کو پڑھنے کے لئے تقریباً اسی عمر سے بٹھا دیتے تھے، اور وہ ابتدائی نوشت و خواند سے جلد فرصت پا کر آٹھ دس سال کی عمر میں پہنچتے پہنچتے مختلف علوم کے مبادیات حفظ کر لیتے تھے، اور سن شعور میں داخل ہوتے ہی علوم کے پیچیدہ مسائل سے دوچار ہو جاتے تھے، امام شافعی فرماتے ہیں:۔

"میں جب مالک ابن انس کی خدمت میں حاضر ہوا، تو موطا حفظ کر چکا تھا، انہوں نے مجھے دیکھکر فرمایا کہ کسی کو بلاؤ، جو تمہارے لئے موطا پڑھے، میں نے کہا، میں خود موطا کا قاری ہوں، چنانچہ میں نے بزبان

۱؎ تذکرۃ السامع ص۱۴۱، ۲؎ خطط مقریزی جلد ۲ ص ۳۸۲، ۳؎ پرموشن آف محمڈن لرننگ نرنیدٰ ناتھ لا ص ۱۲۰ بحوالہ تذکرۃ السلاطین، ۴؎ اکبر نامہ جلد ۱ ص ۲۹۶ نولکشور،

ان کے سامنے موطا پڑھی"[1]

خطیب بغدادی کہتے ہیں:۔

"میں نے سب سے پہلے گیارہ سال کی عمر میں حدیث سنی، کیونکہ میں یوم شنبہ ۲۴ جمادی الاخری ۳۹۲ھ کو پیدا ہوا، اور میں نے پہلی مرتبہ محرم ۴۰۳ھ میں حدیث پڑھی"[2]۔

ابو العباس احمد بن یحییٰ معروف بہ ثعلب نحوی کہتا ہے:۔

"میں نے عربی زبان اور لغت کی تحصیل ۲۱۶ھ میں شروع کی، اور فرا نحوی کے مسائل پر ۱۸ سال کی عمر میں غور کرنے لگا، اور ۲۵ سال کی عمر تک پہونچکر فرا کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جو میرے لئے اچھوتا رہ گیا ہو، بلکہ مجھے یاد نہ ہو گیا ہو"[3]۔

حضرت حسن فرماتے ہیں:۔

"بچپن میں علم کی تحصیل پتھر کی لکیر کے مانند ہوتی ہے"[4]،

مدت تعلیم وتحصیل طلبہ کی تعلیم کے زمانہ کی کوئی حد مقرر نہیں تھی، اور نہ علم کی تحصیل کے لئے کسی عمر کی قید تھی، زرنوجی کہتا ہے، علم کی تحصیل کا زمانہ مہد (گہوارہ) سے لحد تک ہے، بہر حال جب تک جس کے حالات اجازت دیتے، اس زندگی کو قائم رکھتا، چنانچہ اہل علم کے سوانح میں یہ نظر آتا ہے، کہ وہ تعلیم وتحصیل سے فارغ ہوجانے کے باوجود برسوں استاد کی خدمت میں زندگی گذار دیتے تھے، اور استاذ اور معلم کہے جانے کے بجائے شاگرد اور متعلم کہلانا فخر سمجھتے تھے، لیکن پھر وہ اپنے شیخ کے درس کی مسند سے ایسے بن کر اٹھتے، کہ اس کی وفات پر اس کی جانشینی کرسکتے تھے، مثلاً ابن خلکان کا بیان ہے کہ عبد اللہ بن وہب مالکی جو مصر میں امام مالک کے جانشین سمجھے گئے، وہ امام مالک کی خدمت میں بیس سال تک تحصیل علم میں مصروف رہے تھے،[5]

[1] وفیات الاعیان جلد اص ۲۶۶، [2] ابن عساکر جلد اص ۳۹۰، [3] وفیات الاعیان جلد اص ۳۰، [4] تعلیم المتعلم ص ۴۰، [5] وفیات الاعیان جلد اص ۳۱۲،

ابو اسحاق شیرازی جو مدرسہ نظامیہ بغداد کے صدر معلم تھے، اپنے استاذ قاضی ابو الطیب کی مجلس میں دس سے زیادہ مدت تک مسلسل شریک رہے۔[1]

حاکم صاحب المستدرک نے شیخ ابو الحسین محمد بن محمد بن یعقوب نیشاپوری متوفی ۳۴۶ھ کی صحبت میں تحصیل و تعلم کیلئے ۲۰ سال سے زیادہ گذار دیئے۔[2]

اسی طرح امام احمد بن حنبل غندر کے متعلق اور ابو الولید طیالسی یحیٰ بن سعید کے متعلق بیان کرتے ہین کہ ان دونوں نے شعبہ کی صحبت میں کامل بیس سال گذارے تھے، اور ابو عوانہ نے تو یزید بن زریع کی خدمت میں چالیس سال بسر کر دیئے۔[3]

نیز طلبہ اپنے استادوں اور دوسرے مصنفوں کی خدمت میں ان کی کتابوں کی قرأت اور سماع کی سند کے لئے قیام کرتے تھے، اور اس میں بھی سالہا سال لگ جاتے تھے، ابن مغربی کا بیان ہو کہ میں ابن حزم کیسا تھ سات برس تک رہا، اور ان سے انکی تمام تصنیف سنیں[4] تاہم اس کا یہ مقصد نہیں کہ سست رفتاری سے ساری عمر طالب علمی کا سلسلہ قائم رکھتے تھے، بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا، نوجوانی کے زمانہ کو علم کی تحصیل میں پورے انہماک سے صرف کرتے، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں،" اپنے فراغت نشاط اور عافیت اور نوجوانی کے زمانہ کو غنیمت جانو......"

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں" فقہ کی تحصیل بال سپید ہونے سے پہلے کر لو" امام شافعی فرماتے ہیں،" سردار بننے سے پہلے حاصل کر لو جب سرداری آجائیگی، تو علم حاصل نہ کر سکو گے" پھر لکھتے ہیں:

"لیکن علم کے کمال کے باوجود اپنے کو مشائخ سے مستغنی نہ سمجھو"

قاضی ابن جماعہ ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:-

"اپنی جوانی اور عمر کے وقتوں کو تحصیل میں لگانے میں عجلت کرو، کیونکہ عمر کی جو گھڑی گذرتی ہے، اس کا بدل کوئی دوسرا موجود نہیں"[5]

---

[1] وفیات الاعیان جلد۱ ص۲ [2] تذکرۃ الحفاظ جلد۳ ص۲۴۱ [3] ر جلد۳ ص۱۸۳ غندر، ۲۷۷ (سعید) ۲۳۶ (ابو عوانہ) [4] ر ص۳۲۲ [5] تذکرۃ السامع ص۷۱ و ۱۳۴

جب جب طالب علم کی تعلیم ختم ہوتی تھی، وہ مدرسہ سے رخصت ہوتا تھا، اور لڑکے مختلف ملکوں میں مختلف مدتوں میں فارغ ہوتے تھے، جیسے ابن خلدون لکھتا ہے کہ مغرب کے عام شہروں میں مدرسوں میں عموماً ۱۶ سال میں تعلیم ختم کراتے تھے لیکن شہر تونس میں صرف پانچ برس میں لڑکوں کو پڑھا کر تیار کر دیتے تھے،

علماء اور طلبہ کی جسمانی ریاضت | اگرچہ موجودہ زمانہ کی ورزشوں کے نظام کے مثل اسلامی مدرسوں کے نظام اور دستور العمل میں کوئی مستقل انتظام نہ تھا، لیکن علماء و طلبہ اپنی جسمانی ریاضت کا خاص اہتمام کرتے تھے، تیر اندازی، اور اسپ سواری ان کی مشہور ورزشیں تھیں،

صحیح بخاری میں اس گھوڑ دوڑ کا ذکر آیا ہے جس کا اہتمام آنحضرت صلعم نے خود فرمایا تھا، اور حضرت عبد اللہ بن عمر بھی گھوڑے پر سوار تھے، اونٹوں کی دوڑ بھی مشہور ہے جس میں آنحضرت صلعم کی اونٹنی دوڑی تھی[1] حضرت ابن عون کے متعلق روایت ہے، کہ وہ گھوڑے کی سواری کا شوق رکھتے تھے اور ایک مرتبہ میدان میں گھیر کر گورخر کا شکار کیا تھا[2] امام شافعی کو تیر اندازی میں ایسا ملکہ حاصل تھا کہ قریش میں کوئی دوسرا شخص ان کے ایسا موجود نہ تھا، وہ ایک ساتھ دس تیروں سے دس نشانے مارتے تھے[3] امام بخاری اکثر میدان میں گھوڑے پر نکل جاتے، اور تیر اندازی کی مشق کرتے، ان کے متعلق بھی کہا گیا ہے، کہ ان کے تیر کم خطا کرتے تھے[4] نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خانصاحب شروانی نے علمائے سلف میں "جسمانی ریاضت" کا عنوان قائم کر کے اسے تفصیل سے بیان کیا ہے[5]

مدرسوں میں بھی اگرچہ ورزشوں کا انتظام موجودہ زمانہ کے مثل نہ تھا مگر ماہرین تعلیم نے مدرسہ کے لڑکوں کو جسمانی ریاضت میں خاص طور پر چہل قدمی کرنے کا مفید مشورہ دیا ہے، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں:-

"ٹہلنے اور جسم کی ریاضت کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے کیونکہ وہ حرارت برانگیختہ کرتے ہیں، ردی فضلات زائل کرتے ہیں اور بدن میں نشاط پیدا کرتے ہیں[6]"۔

---

[1] صحیح بخاری [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۳۸ [3] ر جلد ۱ ص ۳۳۱ [4] مقدمہ فتح الباری ص ۵۰۶ [5] علمائے سلف ص ۱۲۷ و ۱۲۸ طبع دوم [6] تذکرۃ السامع ص ۳۰،

نیز مختلف علماء کے سوانح سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ پابندی سے جسمانی ریاضت کا اہتمام کرتے تھے، ابن بطوطہ مصر کے بعض علماء کے متعلق لکھتا ہے، :-

"انہی میں قوام الدین کرمانی ہیں، ان کی سکونت جامع ازہر کی اوپر کی منزل میں ہے، ان کے حلقہ میں فقیہوں اور قاریوں کی ایک جماعت ہے، جو ان سے وابستہ رہتی ہے، اور ان سے مختلف فنون کا درس لیتی ہے، اور فتاویٰ دیتی ہے، ان کے لباس میں موٹے اور بھدے اون کی ایک عبا، اور سیاہ اونی عمامہ ہے"

"ان کے روزانہ کے معمولات میں یہ داخل ہے، کہ وہ عصر کی نماز کے بعد فرحت بخش مقاموں اور تفریح گاہوں میں اپنے ساتھیوں سے علحدہ ہو کر تنہا چلے جاتے ہیں"[1]

حقیقت میں اس زمانہ میں لڑکوں اور معلموں کے ذمہ مختلف فرائض اس قدر تھے، کہ ان کی ورزش آپ سے آپ ہو جاتی تھی، اور وہ موجودہ زمانہ کے لوگوں سے زیادہ صحیح اور تندرست رہتے تھے، انھیں علحدہ ورزش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، اس کے علاوہ اس زمانہ میں پا پیادہ چلنے کا رواج خاص طور پر علم کی طلب میں بہت زیادہ تھا، لوگ سیکڑوں میل پا پیادہ سفر کر ڈالتے تھے، اسلئے ان کے ٹہلنے اور پیدل چلنے کی مشق جاری رہتی تھی، جسکی عادت اس زمانہ کی شہری زندگی میں کم لوگوں کو رہ گئی ہے، اسلئے اگر موجودہ اور پچھلے زمانہ کے لوگوں کی عمر کا اوسط نکالا جائے تو اُس زمانہ کے لوگ بڑی عمروں کے ثابت ہوں گے،

نزہت گاہوں کی سیر اور دوسرے تفریحی مشاغل

سیر و تفریح کا مدرسوں میں بھی لحاظ رکھا جاتا تھا، جب لڑکے درس و مطالعہ سے تھک جاتے تو فرصت کے وقتوں میں نزہت گاہوں کی سیر کا مشورہ دیا جاتا تھا، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں:

اگر دل، دماغ اور ذہن اور نگاہ تھک جائے، یا کمزوری معلوم ہو تو سیر گاہوں میں سیر اور تفریح کرنے میں کوئی ہرج نہیں، تاکہ پہلی حالت پھر لوٹ آئے[2]،

[1] ابن بطوطہ جلد ۱ ص ۳۱ - [2] تذکرۃ السامع ص ۷۹،

اساتذہ و علماء بھی سنجیدہ علمی مشغلوں سے تھک کر تفریح کے لئے دوسرے دلچسپ مشاغل اختیار کرتے تھے، حضرت ابن عباسؓ جب حدیث بیان کرتے کرتے تھک جاتے، تو شاگردوں سے فرماتے، کہ "جاؤ شعراء کے دیوان اٹھا لاؤ"۔[۱]

ابن خلکان کا بیان ہے کہ ابو نصر فارابی اپنے دمشق کے قیام کے زمانہ میں زیادہ تر کسی آبشار کے پاس یا کسی باغ کے چمن میں بیٹھکر اپنی کتابیں تصنیف کرتا تھا، اور اس کے حاجتمند وہیں جاکر اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔[۲]

اہل علم کبھی کبھی باغوں میں دعوتوں کا اہتمام کرتے تھے، مشہور محدث ابن خزیمہ نے ۳۰۹ھ میں باغ میں بڑے پیمانہ پر ایک دعوت دی تھی، جس میں شہر کے تمام محدثین اور طلبہ شریک ہوئے تھے۔[۳]

طریقۂ تادیب، قاضی ابن جماعہ لڑکوں کی سرزنش کا طریقہ یہ بتاتے ہیں، کہ اگر کسی طالب علم سے کوئی بات تہذیب کے خلاف سرزد ہو تو اس شخص کے سامنے نرمی سے سمجھایا جائے، جس کے سامنے بدتہذیبی کی گئی ہو، اگر وہ باز نہ آئے تو پوشیدہ طور پر اسے سمجھایا جائے گر یہ بھی کارگر نہ ہو تو اسے سخت الفاظ میں علانیہ تنبیہ کیجائے، اور اگر یہ ڈانٹ ڈپٹ بھی کام نہ آئے، تو اس صورت میں اس لڑکے کو علٰحدہ کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے خصوصاً اگر اس کا اثر دوسرے طالب علموں میں پھیل جانے کا اندیشہ ہو۔[۴]

یحیٰی بن محمد بن یحیٰی بن سلام کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ قاضی اسد بن فرات درس میں مصروف تھے درس کے اثناء میں، رویت باری سے متعلق ایک حدیث آئی، شاگردوں کی صف میں سلیمان الفراء جس نے بعد میں سلیمان المعتزلی کے نام سے شہرت حاصل کی مجلس کے اخیر میں بیٹھا تھا وہ اس وقت تک بدعتیوں کے عقیدوں سے کچھ متاثر ہو چکا تھا، اس نے اس حدیث پر کوئی اعتراض کیا، پھر رویت باری کے عقیدہ سے مجلس میں علانیہ انکار کر بیٹھا، اس کا طرز عمل گستاخانہ تھا، یہ دیکھ کر قاضی اسد سخت برہم ہوئے، اور غیظ و غضب میں اٹھ کر سلیمان کی داڑھی اور گردن پکڑ لی، اور بے تحاشا مارتے مارتے لہولہان کر دیا، اس کے بعد اپنے درس کے حلقہ سے نکال دیا۔[۵]

---

[۱] تعلیم المتعلم ص ۵۱۔ [۲] وفیات الاعیان جلد ۲ ص ۱۰۳۔ [۳] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۲۶۳۔ [۴] تذکرۃ السامع ص ۶۱۔ [۵] تاریخ صقلیہ جلد ۲ ص ۲۸۶

قاضی اسد بن فرات کا یہ طرزِ عمل درحقیقت موجودہ زمانہ کے "سرٹیفکیٹ" کے طریقہ کے مانند ہے، کہ یہ سزا ایسے موقعوں پر دیجاتی ہے، جب کسی طالب علم سے کوئی ایسا جرم سرزد ہو، جس کے دوسرے طلبہ میں پھیل جانے کا اندیشہ ہو، چنانچہ اس موقع پر بھی سلیمان المعتزلی کے رویت باری کے عقیدہ سے انکار کا اثر حلقہ کے دوسرے لڑکوں تک پھیل سکتا تھا، یہی وجہ ہے کہ جیساکہ قاضی ابن جماعہ نے کہا ہے کہ اگر اس کا اثر دوسرے لڑکوں تک پھیل سکتا ہو، تو اسے مدرسہ سے خارج کر دینا چاہئے، قاضی اسد نے اسی کے مطابق اپنا طرزِ عمل اختیار کیا، ورنہ اس کا یہ مقصد نہیں کہ مسلمان ماہرین تعلیم لڑکوں کو عام طور پر پاداش میں سنگین سزائیں دینے کے حامی تھے، جیساکہ ڈاکٹر دانیال ہانے بیرک نے شیخ سعدی کی گلستان کے ایک قصہ اور جرمن سیاح اولیاریوس کے ایران کے ایک مکتب میں مشاہدہ سے قیاس کرکے یہ رائے قائم کی ہے، کہ اسلامی مدرسوں میں لڑکوں کے ساتھ سختی اور بے رحمی کا برتاؤ کیا جاتا تھا، اس لئے یہ سمجھنا چاہئے، کہ

"اسلامی مکاتب میں بچوں کی محبت کو راہ نہ تھی"[۱]

اسلامی مدارس میں استاذ بچوں کے ساتھ کس قسم کی پدرانہ شفقت سے پیش آتے تھے، اس کا اندازہ آگے چل کر ہوگا، یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ مسلمان ماہرین تعلیم لڑکوں پر جبر و تشدد کے کرجانے اور انھیں سخت سزائیں دینے کے سخت مخالف تھے، قاضی ابن جماعہ کا بیان اوپر گذرا، ابن خلدون اپنے مقدمہ میں لکھتا ہے:

"تعلیم میں سختی طلبہ خصوصاً چھوٹے بچوں کے لئے سخت مضر ہے، طالب علم کی تربیت کا دارومدار سختی پر ہوگا، تو اس کا انبساط و نشاط فنا ہو جائے گا، اور یہ سختی اس میں کاہلی اور سستی پیدا کرے گی، اور سزا سے بچنے کیلئے اس کو جھوٹ اور نفاق، اور مکر و فریب کی طرف مائل ہونا پڑے گا، اور یہ چیزیں اس کی ایک عادت بلکہ اس کا خلق بن جائیں گی، اور انسانیت کی اجتماعی خصوصیتیں یعنی حمیت اور مدافعت فنا ہو جائیگی، اور وہ اس میں دوسروں کا محتاج ہو جائے گا،

جس قوم نے اس قسم کے جبر و تشدد کے ساتھ زندگی بسر کی، اسمیں تمام بداخلاقیاں پیدا ہو گئیں

بچوں سے سلوک

[۱] اسلامی نظام تعلیم ص ۱۴۱،

یہود کو دیکھو کہ ان کی بداخلاقیاں یعنی ان کی خباثت اور مکاری کس قدر ضرب المثل ہو گئی ہے اس بنا پر طالب علم کے متعلق معلم کا اور بچے کے متعلق باپ کا فرض یہ ہے، کہ ان کی تادیب میں جبر و استبداد کا طریقہ نہ اختیار کریں، محمد بن ابو زید نے معلموں اور متعلموں کے احکام کے متعلق جو کتاب لکھی ہے، اس میں لکھا ہے کہ بچوں کے متودب کو بوقت ضرورت تین بید سے زیادہ لگانا سزاوار نہیں،

تعلیم کا بہترین طریقہ وہ ہے جس کی تلقین رشید نے اپنے بیٹے امین کے معلم کو کی تھی، اس نے کہا کہ اے احمر! امیر المومنین نے اپنی روح اور اپنے دل کا پھل تیرے سپرد، اور تیرے ہاتھ کو اس پر دراز اور تیری اطاعت کو اس پر واجب کر دیا ہے، اب امیر المومنین نے تیرا جو درجہ مقرر کیا ہے، اس پر قائم رہ، اس کو قرآن پڑھا، اس سے اشعار کی روایت کروا، اس کو احادیث سکھا، اور ہنسنے کے اوقات کے علاوہ اس کو ہنسی سے روک کوئی وقت ایسا نہ گذرنے پائے، کہ تو اس کو کوئی فائدہ نہ پہونچائے، لیکن اس کے ساتھ اس کو غمگین نہ کر کہ اس کا ذہن مردہ ہو جائے، اور اس قدر نرمی بھی نہ اختیار کر کہ وہ عیش و فراغ کا خوگر ہو جائے، جہاں تک ممکن ہو تقرب و تلطف کیساتھ اسکی تربیت کر، لیکن اگر وہ اس سے متاثر نہ ہو، تو تو سختی کر سکتا ہے[۱]"

امام غزالی نے بھی احیاء العلوم میں طلبہ پر سختی کرنے کی ممانعت کی ہے لکھتے ہیں:-

"چوتھا فرض جو پیشۂ تعلیم کی باریکیوں میں ہے وہ یہ ہے، کہ طالب علم کو بداخلاقی سے اشارہ اور کنایہ میں جہاں تک ممکن ہو، روکا جائے، اور اس کی تصریح نہ کی جائے، اور مہربانی کا طریقہ رکھا جائے، ڈانٹ ڈپٹ نہ کی جائے، کیونکہ تصریح ہیبت کا پردہ چاک کر دیتی ہے، اور مخالفت کی جرأت دلاتی ہے، اور اس بداخلاقی پر اصرار کرنے کی حرص پیدا کرتی ہے، اس کے علاوہ اشارہ و کنایہ اچھی طبیعتوں کو اپنے معانی کے سمجھنے اور نکالنے کی طرف مائل کرتی ہے، اور اس کے معنی کا

[۱] مقدمہ ابن خلدون ص ۶۱۹ تا ۶۲۰،

سمجھنا اس پر عمل کرنے کی ترغیب دلاتا ہے۔[۱]

قاضی ابن جماعہ ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں :-

"اگر کسی طالب علم سے کوئی بات سرزد ہو تو جھڑک دینے اور سختی کرنے کے بجائے نرمی اور مہربانی سے نصیحت کیجائے، اور اس کا مقصد اس میں حسن تربیت پیدا کرنا، اس کے اخلاق کا سنوارنا، اور اس کی حالت کا درست کرنا ہو، اگر وہ طالب علم اشارہ سے سمجھ سکے، تو تصریح سے کہنے کی ضرورت نہیں ہے، اور اگر وہ تصریح کئے بغیر نہ سمجھ سکتا ہو، تو اسی طریقہ سے سمجھایا جائے، اور بہ تدریج اس کی تربیت کیجائے، اور اسے اچھی عادتیں سکھائی جائیں، اور عمدہ اخلاق اختیار کرنے کا شوق دلایا جائے، اور شرعی طریقہ پر اسے اچھی باتوں کے اختیار کرنے کی تلقین کیجائے"۔[۲]

سالانہ امتحان اسلامی ملکوں کے مدرسوں میں سالانہ امتحان کا طریقہ رائج تھا یا نہیں، اسکی تصریح نظر سے نہیں گذری، البتہ ہندوستان میں بیجاپور میں عادل شاہ نے نظام تعلیم کے چند اصول وقواعد بنائے تھے، جن میں طالب علموں کے سالانہ امتحان کے لئے جانے اور انھیں انعامات دیے جانے کی تصریح موجود ہے،

"وہر سال امتحان می شد واز انعام ہون سرفرازی می فرمودند"[۳]

تعطیل اسلامی مدرسے موجودہ زمانہ کے برخلاف ہفتہ میں ایک دن کے بجائے سہ شنبہ اور جمعہ کو دو دن بند کئے جاتے تھے، کیونکہ اس زمانہ میں لڑکوں کے ذمہ کتابوں کے نسخ کرنے کی ذمہ داری بھی تھی، اسلئے وہ ان تعطیل کے دنوں میں اس کام کو کرتے، قاضی ابن جماعہ ایک سلسلہ میں لکھتے ہیں :-

"اگر طالب علم سے یہ روزانہ انجام نہ پاسکے تو چھوٹے ہوئے کاموں کو سہ شنبہ اور جمعہ کی رات میں کریں،[۴] (کیونکہ ان دونوں راتوں میں درس کے لئے مطالعہ نہیں کرنا ہوتا)

صاحب الشقائق النعمانیہ اس سے زیادہ واضح طور پر ایک سلسلۂ بیان میں لکھتا ہے :-

---

[۱] احیاء العلوم جلد ا کتاب العلم، باب اداب المعلم والمتعلم، [۲] تذکرۃ السامع ص ۵۰، [۳] بساتین السلاطین ص ۳۵۱، [۴] تذکرۃ السامع ص ۳۵۱

"اوران کے حالات میں یہ بھی ہے، کہ ان کے زمانہ تک لڑکوں کو منگل اور جمعہ کے دن چھٹی ہوتی تھی مولی موصوف نے دوشنبہ کا دن بھی اس میں بڑھادیا، اور اس کا سبب یہ تھا کہ اس زمانہ میں علامہ تفتازانی کی کتابوں کو شہرت حاصل ہوئی، اور لڑکے ان کے پڑھنے کے مشتاق ہوئے، اور یہ کتابیں قیمت سے بھی دستیاب نہیں ہوتی تھیں، کیونکہ ان کے نسخے زیادہ شائع نہیں ہوئے تھے، اس لئے وہ ان کے لکھنے پر مجبور ہوئے، اور جب لکھنے کے وقت میں تنگی دکھائی دی تو مولی موصوف نے تعطیل کے دنوں میں دوشنبہ کا اضافہ کر دیا"[1]

موسمی تعطیلات اسلامی مدرسوں میں تہواروں کے علاوہ موجودہ زمانہ کی طرح موسمی تعطیلات کا رواج تھا یا نہیں اسکی تعیین دشوار ہے تاہم بعض مستشرقین کا نفی میں فیصلہ کرنا صحیح نہیں ہے، قاضی ابن جماعہ کا یہ بیان اس سلسلہ میں غور کرنے کے لائق ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"بعض بڑے علما، اپنے شاگردوں کے ساتھ سال کے بعض حصوں میں تفریح کے بعض مقامات میں جاتے تھے، اور وہاں تفریح حاصل کرتے تھے"[2]

اور قاضی ابن جماعہ نے سخت گرمی اور جاڑے کے وقت درس وتدریس کی ممانعت کی ہے،[3]

---

[1] الشقائق النعمانیہ برحاشیہ ابن خلکان جلد ا ص ۳۰-۳۱ [2] تذکرۃ السامع ص ۹۳-۱۰۲ [3] ص ۳۳

(۴)

اساتذہ کے فرائض

اسلامی مدارس کے معلمون کے فرائض چند نوعیتوں کے تھے، ایک خود ان کی سیرت و کردار پر چند قیود و عائد تھے، دوسرے اساتذہ اور طلبہ کے باہمی تعلقات کے سلسلہ میں ان کے ذمہ چند واجبات تھے، پھر ان کے حلقہ درس میں ان کے بعض معمولات مقرر تھے،

ان میں سے دونوں اول الذکر کا اجمالی بیان ذیل میں پیش ہے، اور آخر الذکر کی تفصیل حلقہ درس کے بیان میں آئے گی،

اساتذہ کی ذاتی سیرت و اوصاف

اسلامی دور تعلیم میں استادوں اور لڑکوں کے تعلقات روحانی باپ اور بیٹوں کے طور پر قائم تھے،

اساتذہ لڑکون کے صرف تعلیمی مشاغل کے ذمہ دار نہ تھے، بلکہ ان میں روحانی پاکیزگی، اور بلند اخلاق پیدا کرنا بھی اون کے فرائض میں داخل تھا، اس لئے جس طرح ایک گھر میں باپ اپنے بچوں کی آیندہ زندگی کے لئے نمونہ ہوتا ہے، اسی طرح اساتذہ کی زندگی طلبہ کے لئے اسوۂ عمل تھی، اسلئے ضروری تھا، کہ اساتذہ بھی ذاتی طور پر کامل دیندار اور محاسن اخلاق اور تہذیب اور شایستگی کے سراپا پیکر ہوں، اسلئے اسلام کے تعلیمی دستور العمل میں شاگردوں کو ان کے تعلیمی فرائض کے ساتھ تربیت، اور تہذیب نفس کے اصول بنائے گئے ہیں،

اسی طرح استادوں کی دینداری، تہذیب اخلاق، اور طرز زندگی پر نگاہ رکھی گئی ہے،

چنانچہ قاضی ابن جماعہ نے اپنی کتاب میں استادون کے آداب میں جو باب باندھا ہے اسمیں انہی

اصول کی تشریح کی ہے، تقریباً انہی اصولوں کے مانند امام غزالی نے بھی احیاء العلوم جلد ا کتاب العلم میں اساتذہ کے اوصاف اجمال کے ساتھ بیان کئے ہیں، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں:۔

استادوں کے لئے ذیل کے چند ذاتی اوصاف ضروری ہیں:۔

خوفِ خدا علماء اور اساتذہ پر واجب ہے، کہ وہ بزم و خلوت ہر جگہ اپنے تمام اقوال و افعال اور حرکات و سکنات میں خوفِ خداوندی ملحوظ رکھیں، کیونکہ جو علوم انھیں ودیعت کئے گئے ہیں، ان کے حقیقی نگہبان اور امانت دار وہی ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

لَا تَخُونُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ وَ تَخُونُوا	اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو، اور نہ
اَمَانَاتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُونَ،	اپنی امانتوں میں خیانت کرو، تم (خیانت
(انفال - ع ۳)	کے وبال سے) واقف ہو،

ایک دوسری جگہ فرمایا:۔

بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ وَ	کیونکہ وہ اللہ کی کتاب کے محافظ ٹھہرائے
كَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ	گئے تھے، اور وہ اس کی حفاظت کرتے بھی
وَاخْشَوْنِ، (مائدہ - ع ۵)	رہے، لوگوں سے نہ ڈرو ہم سے ڈرو،

وقار و متانت علماء کی زندگی متانت اور وقار کی ہونی چاہئے، امام شافعی فرماتے ہیں:۔

"علم صرف یہ نہیں ہے کہ علم کی چیزیں رٹ لی جائیں، علم کے لئے متانت، وقار، خشوع و خضوع اور خاکساری پر عمل کرنا اور قائم رہنا ضروری ہے"[1]

قتیبہ امام مالک کے درس کی مجلس کے متعلق کہتے ہیں:۔

"امام مالک کی مجلس وقار، حلم، اور علم کی مجلس تھی، وہ پُر وقار اور اچھی خصلتوں والے تھے، ان

---

[1] تذکرۃ السامع ص ۱۵، ۱۶،

کی مجلس میں شور اور ہنگامہ نہ تھا، اور نہ آواز بلند ہوتی تھی۔"[1]

امام مالک خلیفہ ہارون رشید کے نام ایک نصیحت نامہ میں فرماتے ہیں:

"جب تم علم حاصل کرو، تو علم کی نشانیاں، متانت، وقار اور حلم بھی اپنے اندر پیدا کرو، کیونکہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے، کہ علماء رسولوں کے وارث ہوتے ہیں"۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

"علم حاصل کرو اور اس کے لئے متانت اور وقار پیدا کرو"[2]۔

شریعت کی پابندی شریعت کی پابندی کرنا معلموں اور عالموں کا سب سے پہلا فرض ہے، وہ اسلامی شعائر اور ظاہری احکام کے پورے پابند ہوں، خاص طور پر مسجدوں میں نماز با جماعت پابندی سے پڑھتے ہوں، ہر خاص و عام کو سلام کرنے میں پیش دستی کرتے ہوں، مصیبت کے وقت صبر کرتے ہوں، سنتوں پر عمل کرتے ہوں، بدعتوں سے دور رہتے ہوں، مسلمانوں کو نیکی کی تلقین کرتے ہوں اور برائی سے بچاتے ہوں، اور مسلمانوں کی قومی اور ملی مصلحتوں کی مذہبی طریق پر پاسداری کرتے ہوں کیونکہ علماء اور اساتذہ ہی عام مسلمانوں اور طالب علموں کے پیشوا ہیں، اگر ایک عالم اپنے علم سے خود فائدہ نہ اٹھائے، تو دوسرے اس سے کیونکر فائدہ اٹھائیں گے، اسلئے عالم کی گمراہی کا جرم زیادہ سنگین اور پر معصیت ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ سے برائیوں کے پھیلنے کا زیادہ امکان ہے، عوام اسکی معصیت سے جری ہوکر زیادہ جرات کیساتھ علانیہ گناہوں کے مرتکب ہوں گے،

اسی طرح علماء کا فرض ہے کہ وہ کلام پاک کی تلاوت پابندی سے کریں، اور دل کو بیدار رکھ کر اللہ تعالےٰ کے ذکر میں مشغول رہیں، اور تلاوت قرآن میں اس کے معنوں اور مطلبوں، اس کے حکموں اور ممانعتوں، اور اس کے وعدوں اور دھمکیوں پر غور و فکر کرتے ہیں،

اخلاق حسنہ اختیار کرنا اس کے ساتھ انہیں محاسن اخلاق کے زیور سے آراستہ ہونا چاہیئے، ان کی سراپا زندگی

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد اص ۱۹۷، [2] تذکرۃ السامع ص ۱۶ – یہ اثر کنز العمال، ج ۵ ص ۲۰۲ میں موجود ہے،

پاکبازی اور قناعت میں بسر ہو، خیرات وصدقات کریں، لوگوں کو کھانا کھلائیں لوگوں سے کشادہ پیشانی سے پیش آئیں، غصہ کو پی جائیں، دوسروں کی مصیبتوں میں ہمدردی کریں، اوران کے دور کرنے کی کوشش کریں، اپنے اثر واقتدار کو لوگوں کے فائدہ پہونچانے اور ان کی جائز سفارشیں کرنے میں صرف کریں، فقیروں کیساتھ لطف ونرمی سے پیش آئیں، پردیسیوں اور رشتہ داروں سے محبت کریں، طالب علموں سے نرمی کا سلوک کریں، ان کی ہر قسم کی دستگیری کریں، اگر کسی کو دیکھیں کہ وہ نماز کا پابند نہیں، طہارت کا لحاظ نہیں کرتا یا دوسرے واجبوں کو علانیہ ترک کرتا ہے، تو اسے تلطف اور نرمی سے سمجھائیں، جیسے کہ رسول اللہ صلعم نے اس اعرابی کو جس نے مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا تھا، نرمی سے سمجھایا تھا مجموعی طور پر اچھے اخلاق اور عمدہ عادتیں توبہ استغفار، اخلاص ویقین، صبر وتقوی، قناعت ورضا، زہد، توکل، صفائی باطن حسن ظن، تجاوز ودرگذر، حسن خلق احسان، شکر نعمت، مخلوق پر شفقت، شرم وحیاء اور محبت الٰہی ایسے جامع خصائل ہیں جنھیں پیدا کرنا چاہیئے اور جو صرف حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی واتباع ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں، اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ، (آل عمران ع ۴)

اخلاق رذیلہ سے اجتناب دوسری طرف انھیں ہر قسم کے برے اخلاق سے اپنا دامن پاک اور صاف رکھنا چاہیئے، خصوصاً بغض، حسد، کینہ، تکبر، بخل، خباثت نفس، خود پسندی، فخر، غیبت، چغل خوری، جھوٹ، بہتان، حرص، طمع، مداہنت، نمود ونمائش، فحاشی، ہزل گوئی، ٹھٹھا، بیہودہ مذاق اور دنیا طلبی یہ ایسے برے اخلاق ہیں، جن سے علماء کو بلند اور برتر رہنا چاہیئے، اس کے بعد قاضی ابن الجماعۃ فرماتے ہیں،

"بہت سے علمائے زمانہ الا ماشاء اللہ ان عیبوں خصوصاً حسد، تکبر، ریاکاری، اور دوسرے لوگوں کو حقیر اور کمتر جاننے میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ان بلاؤں کی دعائیں زہد اور اخلاق کی کتابوں میں موجود ہیں، جو شخص اپنے آپ کو ان عیبوں سے پاک کرنا چاہے، وہ ان کتابوں کی طرف رجوع کرے، ان میں سب سے مفید محاسبی رحمہ اللہ تعالی (متوفی ۲۴۳ھ) کی کتاب الرعایۃ ہے[1]"

[1] تذکرۃ السامع ص ۱۸، ۲۰، ۲۱، ۲۳، ۲۴، ۲۴، کتاب الرعایۃ،

احترام علم اساتذہ اور علماء کا فرض ہے، کہ وہ خود بھی علم کی عزت کریں، اور اپنے کسی طرز عمل سے کوئی ایسا موقع نہ آنے دیں، کہ علم کے احترام کو صدمہ پہونچے، امام اعظم ابو حنیفہ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا:۔

"اپنے عماموں کی عظمت کرو، اور اپنی آستینوں کو وسیع کرو"[1]

امام زہری فرماتے ہیں:۔

"علم کے لئے یہ بھی کسر شان ہے کہ اسے اس کے حاصل کرنے والے کے گھر پہونچایا جائے"

عام اس سے کہ وہ دنیاوی وجاہت اور مرتبہ میں وہ جس قدر بھی بلند درجہ ہو"

البتہ اگر کوئی خاص مجبوری ہو یا کسی دینی مصلحت کا تقاضا ہو تو تعلیم دینے کیلئے استاذ متعلم کے گھر پر جا سکتا ہے، چنانچہ مختلف ائمہ سلف سلاطین اور امراء کے لڑکوں کو پڑھانے کے لئے ان کے محلوں میں تشریف لے گئے، خود امام زہری خلفہ ہشام کے لڑکوں کو پڑھانے کے لئے قصر خلافت میں تشریف لیجاتے تھے امام شافعی مصر کے جلیل القدر خانوادہ بنو عبد الحکم کے یہاں مقیم تھے، اور ان دونوں بزرگوں کے متعلق یہ تصریح سے معلوم ہے کہ انھوں نے ان لوگوں سے مالی مدد قبول فرمائی ہشام نے امام زہری کے سات ہزار دینار کا قرض اتارا اور بنو عبد الحکم نے بعض موقعوں پر ۳ ہزار دینار سے امام شافعی کی مدد کی،

لیکن ان ائمہ کو دینی حیثیت سے جو مرتبہ حاصل تھا، اور ان کی پوری زندگی، دین کی خدمت میں جس اخلاص و حسن نیت سے صرف ہوئی، اسے دیکھتے ہوئے یہ سمجھنا چاہئے، کہ ان لوگوں کا علم سکھانے کے لئے دربار میں جانا کسی دنیاوی غرض سے نہ تھا، ورنہ دنیاوی اغراض، جاہ و منزلت، عزت و شہرت، نام و نمود اور ہمعصروں سے سبقت اور فضیلت حاصل کرنے کی خواہش اسلامی دستور تعلیم کے رو سے بدترین اخلاقی گناہ ہے[2]

امام شافعی فرماتے ہیں:۔

"میں چاہتا ہوں کہ مخلوق، علم کا ایک حرف بھی میری طرف منسوب کئے بغیر اس علم کو مجھ سے

---

[1] تعلیم المتعلم ص۱ [2] تذکرۃ السامع ص ۱۶، ۱۷، و تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۰۳ و مقدمہ سیرۃ عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم ص ۱۴۔

حاصل کرے،

سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ

"مجھے قرآن کا فہم عطا کیا گیا تھا، لیکن جب میں نے ابوجعفر (المنصور) سے تھیلی لے لی، تو وہ فہم مجھ سے چھین لیا گیا، ہم اللہ سے اپنی اس مسامحت پر عفو چاہتے ہیں"۔[1]

چھوٹے پیشوں سے اجتناب علم کے احترام کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ایسے چھوٹے پیشوں کو اختیار نہ کریں جو اہل علم کے شایان شان نہ ہوں، جیسے حجامت، دباغت، صرافہ اور زرگسازی وغیرہ،

تہمت کے موقعوں سے اجتناب انھیں تہمت کے مشتبہ موقعوں سے بھی بچنے کی ضرورت ہے، اگرچہ فی نفسہ وہ ان سے دور ہوں، اور نہ کوئی ایسا کام کرنا چاہئے، جو اخلاق کے بلند اصولوں کے منافی ہو، اور یا جو کام اصل میں برے نہ ہوں، مگر لوگ ظاہر میں انھیں برا سمجھتے ہوں، ان سے بھی دامن بچانا چاہئے، ورنہ لوگوں کو ان کے خلاف اپنے دلوں میں بدگمانی پیدا کرنے کا موقع ملیگا، اور وہ لوگوں کی نظروں سے گر جائیں گے، اور اگر ایسے موقعے پر جانے یا کوئی ایسا کام کرنے کی ضرورت پڑ جائے، تو کچھ لوگوں کو اس سے مطلع کر دینا چاہئے تاکہ وہ لوگ اصل حقیقت سے پہلے سے آگاہ رہیں، اور بدگمانی پیدا ہونے کی نوبت نہ آئے[2]

مشاغل کی پابندی اور اوقات کی حفاظت علماء و اساتذہ کا فرض ہے، کہ وہ کوشش اور محنت میں ہمیشہ مصروف رہیں، اور ان کے عبادت کرنے، پڑھنے پڑھانے، غور و فکر کرنے، تصنیف و تالیف اور بحث و نظر کرنے میں ان کے جو معمولات ہوں، انھیں پابندی سے قائم رکھیں، ان کے سلسلہ کو نہ توڑیں،

انھیں اپنا وقت سب سے زیادہ عزیز رکھنا چاہئے، مختلف غیر علمی و تعلیمی مشغولیتوں، کھانے پینے، ملنے ملانے، روزی حاصل کرنے، راحت و آرام کرنے اور خانگی زندگی میں وقت گذارنے میں کم سے کم وقت صرف کریں، ربیع بن سلیمان مرادی، امام شافعی کے متعلق بیان کرتے ہیں، کہ

---

[1] تذکرۃ السامع ص ۱۹ [2] ص ۱۹-۲۰،

"میں نے انہیں دن کے وقت کھاتے اور رات کے وقت سوتے ہوئے نہیں دیکھا، وہ اپنے وقت کا بڑا حصہ تصنیف میں گذارتے تھے"۔

حقیقت یہ ہے، کہ علم کا مرتبہ رسولوں کی جانشینی کے درجہ تک پہنچا ہے، یہ بلند مرتبہ تکلیفیں اور مشقتیں اٹھائے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، صحیح مسلم میں روایت ہے،

"جسم کی آسایش کے ساتھ علم کو تابع نہیں بنایا جاسکتا تھا"۔

ایک دوسری روایت میں ہے،

"جنت تکلیفوں اور مصیبتوں سے حاصل ہوتی ہے"[۱]۔

مطالعہ کا استمرار علماء اور اساتذہ کو مطالعہ کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھنا چاہئے، حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں،

"عالم اسی وقت تک عالم رہ سکتا ہے، جب تک وہ طالب علم ہے، جب وہ پڑھنا چھوڑ دے، اور سمجھے کہ وہ علم سے بے نیاز ہوگیا، اور جو کچھ اس نے حاصل کرلیا، وہ اس کے لئے کافی ہے، تو ایسا سمجھنے والا سب سے بڑا جاہل ہے"[۲]۔

چھوٹوں سے استفادہ علماء کیلئے تو یہ بھی معیوب نہیں کہ وہ اپنے چھوٹوں سے استفادہ کریں، علم کی تحصیل خواہ کسی صورت اور شکل میں کسی سے بھی ہو، وہ معیوب نہیں ہے،[۳] "حکمت مومن کی کھوئی ہوئی دولت ہے، اسے جہاں پائے اٹھالے"، ایک دوسری روایت میں ہے، "حکمت کا کلمہ جہاں ملے، حاصل کرو، خواہ وہ مشرکوں کے ہاتھوں سے ملے"[۴]۔

ابوبکر عبداللہ بن زبیر حمیدی متوفی ۲۱۹ھ جو امام شافعی کے شاگرد تھے، فرماتے ہیں:-

"میں شافعی کی معیت میں مکہ سے مصر تک گیا، راستہ بھر ہم دونوں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے رہے، میں ان سے فقہ کے مسئلے پوچھتا، اور وہ مجھ سے حدیثیں سنتے تھے"۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں،

---

[۱] تذکرۃ السامع ص ۲۶ و ۲۷ و ۲۸ [۲] ،، ص ۲۹ و ص ۲۸ [۳] ،، ص ۲۸، [۴] مختصر جامع بیان العلم ،

"تم لوگ مجھ سے حدیث زیادہ جانتے ہو، اگر تمہارے پاس کوئی صحیح حدیث نکلے، تو مجھے بتادیا کرو میں تم سے لے لوں گا"[1]

اشہب بن عبد العزیز کہتے ہیں :-

"میں نے ابوحنیفہ کو مالک کے سامنے ایسا دیکھا جیسے کوئی بچہ اپنے باپ کے سامنے ہو"

اس پر امام ذہبی فرماتے ہیں، کہ "یہ ابوحنیفہ کے حسن ادب اور تواضع کی بڑی دلیل ہے، حالانکہ وہ مالک سے تیرہ سال بڑے تھے"[2]

تصنیف وتالیف کا شغل، علماء کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ تصنیف اور تالیف میں مشغول رہیں لیکن یہ دشوار گذار راہ اسی وقت اختیار کریں جب اس پر چلنے کی پوری استعداد وآگہی ہو، اور اثنائے راہ کی منزل کی دشواریوں سے پوری آگاہی ہو، علوم وفنون کے حقائق بیان کرنے کے لئے تفتیش ومطالعہ غور وفکر وتدبر اور کتب کے مراجعہ کی ضرورت ہوتی ہے،

اپنی تصنیف کے لئے ایسا موضوع منتخب کریں، جس کا نفع عام ہو، اور لوگوں کو اس کی ضرورت ہو، خصوصاً ایسی چیزیں لکھیں، جس پر پہلے سے کوئی تصنیف موجود نہ ہو، عبارت میں اعتدال قائم رکھیں نہ زیادہ طویل ہو، اور نہ زیادہ مختصر کہ مفہوم واضح نہ ہو سکے،

اپنی تصنیف اس وقت تک شائع نہ کریں، جب تک اس پر نئے سرے سے نظر ثانی نہ کر ڈالیں اور اس کے مسائل ومباحث اور سیاق وسباق پر کامل غور وخوض نہ کریں،

اگر تصنیفی استعداد موجود نہ ہو تو ہرگز قلم ہاتھ میں نہ اٹھائیں، کیونکہ ہر عالم کے لئے مصنف ہونا ضروری نہیں ہے،[3]

اساتذہ وطلبہ کے باہمی تعلقات اوپر بیان کیا جا چکا ہے، کہ اسلامی دور تعلیم میں استادوں اور شاگردوں کے

[1] تذکرۃ السامع صـ۲۹، [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ا صـ۱۹۵، [3] تذکرۃ السامع صـ۲۹، صـ۳۰،

تعلقات خالص روحانی بنیادوں پر قائم تھے، استاد روحانی باپ اور شاگرد ان کے روحانی بیٹے تھے، چنانچہ ان دونوں کے باہمی تعلقات اور مراسم میں سب سے زیادہ یہی رشتہ نمایاں ہے، وہ ان کے اخلاق اور سیرت کے کامل نگہبان تھے، جس موقع پر شفقت و محبت کی ضرورت ہوتی شفقت سے پیش آتے، جہاں تنبیہ و تادیب کا موقع ہوتا، تنبیہ کرتے تھے، اشاروں و کنایوں میں نصیحت کارگر ہوتی، تو اشاروں سے کام لیتے اور تصریح سے روکنے کی ضرورت ہوتی، تو صاف گوئی سے کام لیکر روک دیتے، اساتذہ کے سامنے شاگردوں کی آیندہ زندگی کا سوال مستقل طور پر رہتا، اور اسی کے مطابق وہ ان کی تعلیم و تربیت کرتے تھے، بلکہ اساتذہ کا دستور سا مقرر ہوگیا تھا، کہ ہر طالب علم کو چند وصیتیں اس کے حسب حال لکھ کر اس کے سپرد کرتے تھے، جنھیں شاگرد اپنی آیندہ زندگی میں مشعل راہ بناتے تھے، چنانچہ مختلف ائمۂ اسلام کی وصیتیں سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہیں[۱]

استاد کی شفقت استاد شاگردوں کے ساتھ غیر معمولی شفقت لطف اور محبت سے پیش آتے تھے، ان کے اخلاق و عادات کی نگرانی اور ان میں اسلامی پاکبازی اور پرہیزگاری پیدا کرنے کے علاوہ ان کی ہر قسم کی ضرورتوں پر نگاہ رکھتے تھے، اگر وہ درس کے حلقہ میں خلاف معمول نہ آتے، تو ان کے متعلق دریافت کرتے، اور کسی معقول عذر کی صورت میں اُسے دور کرنے کی کوشش کرتے تھے، اسی طرح نادار لڑکوں کی پوشیدہ مالی مدد کرتے تھے، وہ بیمار پڑتے تو ان کی عیادت کو جاتے، ان کے گھر میں کوئی سانحہ پیش آتا، تو تعزیت کرتے، غرض معاشرتی زندگی میں جس نوعیت کے باہمی مخلصانہ تعلقات کی ضرورت ہوتی ہے، استاد اور شاگرد کی باہمی معاشرت میں ان کا صحیح نمونہ موجود تھا،

امام غزالی نے جہاں اساتذہ کو شفقت کرنے کی تلقین کی ہے، اس موقع پر وہ کہتے ہیں کہ معلم کا حق والدین کے حق سے زیادہ ہے، اور جس طرح والدین لڑکوں پر شفقت اور مہربانی کرتے ہیں اسی طرح ان کا بھی فرض ہے کہ وہ متعلمین سے شفقت اور مہربانی سے پیش آئیں[۲]

---

[۱] مختصر جامع بیان العلم ص ۴۳ و تعلیم المتعلم، [۲] احیاء العلوم جلد ۱ ص ۳۶

قاضی ابن جماعہ استادوں کے لئے لکھتے ہیں:۔

"استاد کو چاہئے کہ طالب علم کی ضرورتوں کا لحاظ رکھے اور اس کے ساتھ نرمی اور شفقت سے پیش آنے میں، اس پر احسان کرنے، اور اگر کبھی اس کی کوئی ایسی زیادتی ہو جو لوگوں سے پیش آجاتی ہے، تو اس پر صبر کرنے میں اور بعض وقت اس کی بدتمیزی برداشت کرنے میں، اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا چاہئے، جو عزیز سے عزیز اولاد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔"[1]

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:۔

"اساتذہ کو چاہئے کہ وہ طالب علموں کی مصلحتوں اور ضرورتوں کا لحاظ کرنے اور ان میں دل کی یکسوئی پیدا کرنے، اور اپنی استطاعت کے مطابق ان کی مالی مدد کرنے کی کوشش کریں کیونکہ جب تک کوئی بندہ اپنے بھائی کی اعانت کریگا، خدا اس کی اعانت کرے گا، اور جو اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرے گا، خدا اس کی حاجت روائی فرمائے گا، اور جو کسی تنگی کے لئے آسانی پیدا کرے گا، خدا قیامت کے دن کا حساب اس پر آسان کرے گا، خاص طور پر علم طلب کرنے میں اعانت کرنا افضل ترین ثواب کا کام ہے۔

استاذ کو چاہئے کہ اگر کوئی طالب علم حلقہ سے خلاف معمول زیادہ غیر حاضر ہو جائے تو اس کا سبب دریافت کرنا چاہئے، اور جو لوگ اسے جانتے ہوں، ان سے اس کے حالات پوچھنے چاہئیں، اور اگر کسی سے اس کا حال معلوم نہ ہو سکے، تو کسی کو اس کے پاس بھیجنا چاہئے، بلکہ اگر وہ خود اس کے گھر جا کر اس کے حالات پوچھے تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔"[2]

سلسلۂ تعلیم کے جاری نہ رکھ سکنے کے موانع کو دور کرنا۔

طالب علموں کی تعلیمی زندگی کے دور میں ایسے موانع پیش آتے ہیں کہ وہ اپنے تعلیمی ذوق کے باوجود مختلف خانگی وجہوں خصوصاً معاشی دقتوں کی وجہ

[1] تذکرۃ السامع ص ۴۹، ۵۰، ۵۲، ر صفحہ ۶۱، صفحہ ۶۲۔

سے اپنی تعلیمی زندگی کے سلسلہ کو توڑنے پر مجبور ہوجاتے ہیں، اسلامی عہد میں اگر اس قسم کی دقتیں کسی طالب علم کو پیش آتی تھیں، تو اساتذہ ذاتی طور پر اس کی دستگیری کرکے اس کے سلسلۂ تعلیم کو جاری رکھتے تھے، قاضی ابو یوسف اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ،

"میں علم حدیث وفقہ کی تحصیل میں مصروف تھا، اور میری مالی حالت کچھ اچھی نہ تھی، ایک دن میرے والد میرے پاس تشریف لائے، میں اس وقت ابو حنیفہ کی خدمت میں حاضر تھا، والد کے ارشاد کے مطابق مجلس سے اٹھ کر ان کے ساتھ ہولیا، انھوں نے فرمایا کہ تم ابو حنیفہ کو اپنے لئے نمونہ نہ بناؤ، وہ خوشحال ہیں، اور تم معیشت کے لئے محتاج ہو، اس کے بعد میں نے مجبوراً تعلیمی مشاغل میں کمی کر دی، اور والد کی اطاعت میں روزی کے سامان میں بھی لگا رہنے لگا"

ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے مجھے حلقہ سے غائب پاکر میرے متعلق دریافت فرمایا :

"اس واقعہ کے بعد جب میں پہلی مرتبہ پھر ان کے حلقہ میں پہونچا تو انھوں نے مجھ سے غیر حاضری کی وجہ پوچھی، میں نے اصل واقعہ بیان کر دیا، اس کے بعد جب لوگ حلقہ سے اٹھ کر چلے گئے تو انھوں نے ایک تھیلی میری طرف بڑھائی، اور فرمایا کہ اس سے کام نکالو اور حلقہ سے غیر حاضر مت ہو جب یہ رقم خرچ ہو جائے، تو مجھے بتا دینا چنانچہ اسکے بعد میں پابندی سے حلقہ میں شریک ہونے لگا، اس تھیلی میں سو درہم تھے، پھر تھوڑے ہی دنوں کے بعد انھوں نے سو درہم کی ایک اور تھیلی عنایت فرمائی"[۵]

طلبہ کی پوشیدہ مالی امداد

اساتذہ بوقت ضرورت طالب علموں کی پوشیدہ مالی مدد کرتے تھے امام ابو حنیفہ کا واقعہ اوپر گذرا، ابو زکریا تبریزی کا بیان ہے، کہ وہ علامہ خطیب بغدادی سے ان کے درس کے حلقہ (جامع دمشق) میں علم ادب کی تعلیم حاصل کرتے تھے، اور ان کا اسی جامع کے منارہ کے اوپر کے حجرے میں قیام تھا، ایک

---

۵ وفیات الاعیان جلد ۲ ص ۴۰۱،

مرتبہ ناگاہ شیخ خطیب بغدادی، اوپر کی منزل میں تشریف لے گئے، اور اپنے عزیز شاگرد سے کہا "آج جی چاہا کہ تم سے مل لوں"، اس کے بعد ایک گھنٹہ تک باتیں کرتے رہے، چلنے کے وقت انھوں نے ایک ورق میری طرف بڑھا کر کہا کہ "یہ مسنون ہدیہ ہے، ان سے چند قلم خرید لینا" یہ کہہ کر وہ تشریف لے گئے، اس میں پانچ دینار تھے، پھر اس کے بعد دوسری مرتبہ آئے اور اتنی ہی رقم رکھ کر چلے گئے[1]

قاضی اسد بن فرات امام محمد کی شفقتوں کے سلسلہ میں کہتے ہیں،:

"میں ایک دن محمد بن حسن کے حلقہ درس میں بیٹھا تھا، ناگاہ سبیل لگانے والے کی آواز آئی، میں جلدی سے اٹھ کر گیا، اور پانی پی کر حلقہ میں واپس چلا آیا، اس پر محمد نے مجھ سے پوچھا "مغربی! تم سبیل کا پانی پیتے ہو؟" میں نے عرض کیا "خدا آپ کو فلاح دے، میں تو ابن سبیل ہوں، درس ختم کر کے میں گھر چلا گیا، رات کے وقت کسی نے دروازہ پر آواز دی، دروازہ کھولا تو معلوم ہوا، امام محمد کا خادم ہے، اس نے مجھ سے کہا، آقا نے آپ کو سلام کہا ہے اور آپ سے کہا ہے کہ مجھے آج سے پہلے بالکل معلوم نہ تھا، کہ تم "ابن سبیل" ہو، اس لئے اس نفقہ کو لیلو، اور اپنی ضرورتیں پوری کرو"۔

اس کے بعد اس نے ایک بھاری تھیلی میری طرف بڑھائی، میں دل میں خوش ہوا کہ اس میں درہموں کی بڑی تعداد ہے، جب میں نے آکر تھیلی کھولی تو دیکھتا ہوں کہ اس میں اسی اشرفیاں بھری ہوئی ہیں"[2]

طلبہ کی عیادت، تعزیت اور غم گساری

اگر کوئی طالب علم بیمار پڑتا یا کسی غم میں مبتلا ہوتا تھا، تو استاذ اس کے مکان پر جا کر اس کی عیادت کرتا، اور اس مصیبت میں ہمدردی کر کے تعزیت کا فرض ادا کرتا تھا، اور اس موقع پر اسے کسی مدد کی ضرورت ہوتی تو امداد کرتا تھا، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں،:

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۳۱۵، [2] معالم الایمان ابن ناجی،

"اگر طالب علم بیمار پڑے، تو استاد کو اس کی عیادت میں جانا چاہیئے، اور اگر وہ کسی غم میں مبتلا ہو تو اس کا غم ہلکا کرنا چاہیئے"۔[1]

اسلامی عہد میں اساتذہ طالب علموں کے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ کیا کرتے تھے، چنانچہ شیخ ابو وداعہ کا بیان ہے، کہ وہ حضرت سعید بن مسیب کے حلقۂ درس کے طالب علم تھے، شیخ نے انکی ایک مصیبت کے وقت جیسی ہمدردی اور غمگساری کی، اسکی مثال کم نظر آئے گی، ابو وداعہ کا بیان ہے کہ وہ اپنی بیوی کے سانحۂ وفات کی وجہ سے چند دنوں کے لئے حضرت سعید بن مسیب کے حلقۂ درس میں شریک نہ ہو سکے، اس کے بعد جب وہ حلقہ میں حاضر ہوئے، اور شیخ نے غیر حاضری کا سبب پوچھا، اور انھوں نے بیوی کے انتقال کی خبر سنائی، تو شیخ کو ملال ہوا، اور فرمایا کہ تم نے مجھے اطلاع نہ دی کہ میں جنازہ میں شریک ہو سکتا، اسکے بعد حضرت سعید بن مسیب نے ان سے ان کی دوسری شادی کے متعلق دریافت کیا، انھوں نے افسوس کے ساتھ اپنی ناداری بیان کی، کہ ان کے پاس مہر ادا کرنے کے لئے دو تین درہم سے زیادہ رقم موجود نہیں، حضرت سعید نے پوچھا کہ اگر وہ سامان کر دیں تو نکاح کر سکتے ہیں،؟ ابو وداعہ نے اثبات میں جواب دیا، یہ سنتے ہی حضرت سعید نے اسی مجلس میں صرف دو یا تین درہم پر اپنی صاحبزادی کو ابو وداعہ کی زوجیت میں دے دیا،

ابو وداعہ حلقہ سے اٹھنے کے بعد گھر آئے، اس دن روزہ سے تھے، شام کو افطار کر کے گھر میں بیٹھے تھے، کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی، ابو وداعہ نے نام پوچھا، تو باہر سے جواب آیا کہ "میں سعید ہوں"، ابو وداعہ کو تعجب ہوا کہ اس نام کے کئی بزرگ شہر میں موجود ہیں، سعید بن مسیب ہو نہیں سکتے، کہ وہ چالیس سال سے سوائے اپنے گھر سے مسجد جانے کے کہیں اور جاتے دکھائی نہیں دیئے، اسی خیال میں انھوں نے دروازہ کھولا، دیکھتے ہیں کہ ان کے استاد سعید بن مسیب ہی سامنے موجود ہیں، ابو وداعہ نے شرم کے ساتھ معذرت کی، کہ انھوں نے خود کیوں تکلیف کی، کسی کے ذریعہ طلب فرما لیا ہوتا، حضرت سعید بن

---

[1] تذکرۃ السامع ص ۶۲، ۶۳،

مسیب نے فرمایا کہ

"میں اس لئے چلا آیا، کہ آج تمھارا نکاح ہوا ہے، یہ اچھا معلوم نہیں ہوا کہ تم اپنے گھر میں تنہا رات گذارو، یہ میرے ساتھ تمھاری بیوی موجود ہیں"

یہ کہہ کر اپنی صاجزادی کو دروازہ کے اندر کردیا، ابو وداعہ کہتے ہیں کہ حضرت سعید کی یہ صاجزادی وہی تھیں، جن سے خلیفہ عبدالملک بن مروان نے اپنے ولی عہد ولید کیلئے پیغام بھیجا تھا، اور حضرت سعید نے یہ رشتہ قبول کرنے سے انکار کردیا تھا، اور یہ خود بھی عالمہ فاضلہ محدثہ اور حافظِ قرآن تھیں[۱]،

مذاکرہ ومناظرہ اساتذہ، علوم کے تازہ رکھنے کے لئے باہمی مذاکرہ کرتے تھے، نیز مختلف مسائل پر تبادلہ خیال کرکے ان کے پوشیدہ گوشوں کو نمایاں کرتے تھے، اسلامی عہد میں ان مذاکروں کا بڑا رواج تھا، انہی سے مناظروں کی ابتدا ہوئی، ان مذاکروں اور مناظروں میں بہت سے مسئلے معلوم ہوجاتے تھے، اس لئے ان میں وہ بڑی توجہ اور انہماک سے وقت صرف کرتے تھے، علی بن حسن بن شقیق کا بیان ہے، کہ ایک مرتبہ وہ اور ابن مبارک مسجد سے عشا کی نماز پڑھکر مکان جانے کے لئے اٹھے، سردیوں کا زمانہ تھا، تیز سردی پڑ رہی تھی، ابن مبارک نے چلتے وقت ابن شقیق سے مسجد کے دروازہ کے پاس کسی حدیث کا تذکرہ کیا، انھوں نے جواب میں کوئی بات کہی اور گفتگو کا سلسلہ جاری ہوگیا، اس وقت سے وہ دونوں مسجد کے دروازہ پر اسی طرح ٹھنڈی رات میں شبنم میں کھڑے گفتگو کرتے رہے، یہاں تک کہ مؤذن آیا، اور اس نے صبح کی اذان دی اسوقت انھیں اس قدر دیر ہوجانے کی خبر ہوئی[۲]

جب اہل علم کسی دوسرے شہر سے آتے تھے، تو وہاں کے احباب اس شہر کے علمی تحفہ کو بڑے اصرار سے اپنے رفیق سے طلب کرتے تھے، ابو علی نیشاپوری کا بیان ہے، کہ وہ بغداد آئے، یہاں مختلف اہل علم ابو احمد عسال، ابو اسحٰق بن حمزہ، ابو طالب بن نصر اور ابو بکر جعابی جمع ہوئے، اور ابو علی سے ایک مجلس میں نیشاپور

---

[۱] وفیات الاعیان جلد ا ص ۲۵۹، [۲] تذکرۃ الحفاظ جلد ا ص ۲۵۵،

کی حدیثوں کی روایتیں سنانے کے لئے کہا گیا، انھوں نے پہلے تامل کیا، لیکن جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو انھوں نے اس مجلس میں تیس حدیثیں روایت کیں، جن میں ایک حدیث کے سوا کوئی ایسی نہ تھی، جوان میں سے کسی کے پاس پہلے سے موجود ہو، البتہ ابوحمزہ نے صرف ایک حدیث کے متعلق اپنی واقفیت کا اظہار کیا[1]

علماء کی شرکت اساتذہ کے حلقوں میں

اس زمانہ میں علماء کو اس کی عام اجازت تھی، کہ وہ اپنے معاصرین کے درس و تعلیم کے حلقوں میں شریک ہوں، اور درس کے درمیان میں استاذ کی تقریر پر ٹوکیں اور سوال و جواب سے مسئلوں کی چھان بین کریں، ایسے مواقع دراصل بڑے نازک ہوتے تھے، طالب علموں کی بھری محفل میں استاذ کی خفت کا سامان ہوتا تھا، اساتذہ اپنے خطبوں پر خود اس قدر تیار ہو کر آتے تھے، کہ وہ بڑے سے بڑے فاضل اجل کے درس کے حلقہ میں آجانے پر بھی مرعوب نہ ہوتے تھے، اور سوالوں کے تشفی بخش جوابات دیتے تھے،

البتہ سیرت کی کتابوں میں ایسے واقعات بھی ہیں، کہ کبھی کبھی بعض مناظرہ پسند طبائع درس کے حلقہ میں استادوں پر ناروا حملے کرتے، اور طعن و طنز سے محفلوں کو مکدر کر دیتے، اساتذہ بھی ایسے لوگوں کی طبیعتوں اور عادتوں سے واقف ہو گئے تھے، جب کوئی ایسا موقع آتا، تو بڑی خوش اسلوبی سے نباہ لیتے تھے، سیوطی نے محمد بن منصور سمعانی کے حلقۂ درس کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے، کہ ایک مرتبہ ان کے حلقۂ درس میں ایک مغربی اہل علم شریک ہوئے، جو کسی قدر تیز اور مناظرہ پسند واقع ہوئے تھے، اور اہل علم میں ان کے مناظروں کی شہرت ہو چکی تھی، ان کے ایک اعتراض کے جواب میں سمعانی نے شاگردوں سے کہا

"جو کچھ آپ فرماتے ہیں اسے لکھ لو، آپ اس سے زیادہ واقف ہیں"

شاگردوں نے بلا تامل تصحیح کرلی یہ طرز عمل دیکھ کر تھوڑی دیر کے بعد نو وارد اہل علم نے پھر کہا

"میرے آقا مجھ سے خطا ہوئی، صحیح وہی ہے جو آپ نے املا کرایا تھا"

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۱۱،

سمعانی نے پھر دوبارہ تصحیح کرا دی، اس کے بعد جب وہ مجلس سے چلے گئے، تو سمعانی نے شاگردوں سے کہا

"یہ حضرت سمجھتے تھے، کہ میں بھی ان سے دوسروں کی طرح الجھ پڑوں گا، اور میرے ساتھ بھی یہ ایسی ہی تیز زبانی سے پیش آئیں گے جیسے دوسروں کیساتھ کرتے رہے ہیں، اسی لئے میں خاموش ہوگیا، اور بالآخر وہ خود رجوع کرنے پر مجبور ہوئے[1]۔"

مجالس مناظرہ ان مذاکروں سے اس زمانہ میں مناظروں کا عام رواج ہوگیا تھا جن میں استاد اور شاگرد دونوں شریک ہوتے، اور مختلف علوم حدیث، فقہ، کلام اور ادب پر مناظرے کی علحدہ علحدہ مجلسیں منعقد ہوتیں، اہل علم سلاطین و امراء کے درباروں میں یہ مجلسیں زیادہ گرم ہوتی تھیں، ملک شاہ کے دربار کے وہ مناظرے یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں، جو امام غزالی اور دوسرے علمائے زمانہ سے ہوئے تھے، ان مناظروں میں اگرچہ کبھی کبھی طرفین حق سے ہٹ کر مناظرانہ ردوکد میں مبتلا ہوجاتے تھے، لیکن عموماً اس زمانہ میں صحیح علمی مذاق اور حق کو حق سمجھ کر قبول کرنے، اور باطل کے باطل ٹھہرنے پر اس سے رجوع کرلینے کی خوبیاں موجود تھیں، اسلئے مناظروں کی ان مجلسوں سے علما، اور طالب علموں دونوں کو فائدے حاصل ہوتے، اور دقیق علمی حقائق آشکارا ہوتے تھے،

پانچویں صدی تک مناظروں کی مجلسوں میں جو بے عنوانیاں پیدا ہو چکی تھیں، اور ردوکد کے مناظروں سے جو برائیاں پیدا ہوتی تھیں، انھیں امام غزالی نے احیاء العلوم میں بیان کیا ہے، اور ان سے احتراز کرنے کی تلقین کی ہے، بلکہ وہ ایسی مناظرانہ مجلسوں کے سرے سے مخالف تھے[2]، کیونکہ وہ خود تلخ تجربے اٹھا چکے تھے،

(۵)

طلبہ کے فرائض

اسلامی مدرسوں کے طالب علموں کے ذمہ جو فرائض تھے، ان کا اندازہ قاضی ابن جماعہ کی ان

[1] بغیۃ الوعاۃ سیوطی ص ۹۰۔ [2] احیاء العلوم جلد ۱ کتاب العلم۔

تقفیون سے ہوتا ہے، جو انھوں نے ایک مستقل باب میں طالب علموں کے لئے مختلف فصلوں" طالب علم کے آداب اپنی ذات کے متعلق طالب علم کے آداب اپنے استاذ کے ساتھ، طالب علموں کے درسوں کے آداب درس کے حلقہ میں پڑھنا، اور حلقہ میں استاد اور شاگرد کے ساتھ اس کا برتاؤ، پھر محشی نے تاریخ اور سیرت کی کتابوں سے جابجا مثالیں دی ہیں، طلبہ کے یہ آئین وآداب چار قسموں میں کئے جا سکتے ہیں، ایک تو طالب علموں کے فرائض اپنی ذات کے متعلق دوسرے استادوں اور شاگردوں کے باہمی معاشرتی اور تعلیمی تعلقات اور تیسرے طالب علموں کے واجبات دارالاقامہ میں، اور چوتھے طلبہ کی ذمہ داریاں ان کے حلقۂ درس میں ان میں سے تیسری قسم یعنی دارالاقامہ میں طلبہ کے فرائض کی تفصیل اوپر گذر چکی، حلقۂ درس میں ان کے جو واجبات ہیں، ان کا بیان آگے آئے گا، بقیہ اوّل الذکر دونوں قسموں کے فرائض اجمالاً ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں[۱]،

طلبہ کے ذمہ خود ان کی ذات کے متعلق جو فرض عائد تھے، انکی بھی دو قسمیں کیجا سکتی ہیں، ایک خود ان کی شخصی اخلاقی تعلیم وتربیت، اور دوسرے ان کے تعلیمی فرائض،

دل کی پاکی اور نیت کا اخلاص

طلبہ کی سیرت کے نشوونما کے لئے پہلی شرط یہ تھی، کہ ان کے دل اور دماغ معصومانہ طور پر پاک اور صاف رہیں، برے اخلاق اور اوصاف سے دامن بچائیں، دل کی پاکی کے ساتھ ان کی تعلیمی زندگی کا آغاز پورے حسن نیت اور اخلاص کے ساتھ ہوا ہو، اور اسلام نے جو تعلیمی نصب العین مقرر کیا ہے، وہ ہر وقت انکی نگاہوں کے سامنے ہو[۲]،

علم کے لئے سفر

اس زمانہ میں ہر طالب علم کا فرض تھا، کہ وہ علم کی طلب کے لئے کوئی نہ کوئی سفر ضرور کرے علم حاصل کرنے کیلئے سفر کرنے کی ابتدا صحابہ کے زمانہ ہی میں ہوئی تھی، جیسا کہ پہلے گذر چکا صحابہ ایک ایک حدیث کی تصدیق کیلئے حجاز سے شام اور شام سے مصر کا سفر کرتے تھے، پھر تابعین نے انہی کے طریقہ کی پیروی کی، بسر بن عبد اللہ حضرمی کہتے ہیں کہ وہ صرف ایک حدیث کے لئے شہر بہ شہر پھرتے رہے ہیں، حضرت

[۱] تذکرۃ السامع ص ۶۷، [۲] احیاء العلوم ج ۱ ص ۳۲ و تذکرۃ السامع؛

سعید بن مسیب نے بھی صرف ایک حدیث کیلئے کئی دن اور رات کا سفر کیا[1]، طلبہ بلا تکلف مغرب سے مشرق اور مشرق سے مغرب صرف علم کی طلب میں جایا کرتے تھے، مقری صاحب نفح الطیب، ابن ناجی صاحب معالم الایمان اور صاحب ریاض النفوس وغیرہ نے ایسے طالب علموں کا حال اپنی کتاب میں مستقل باب قائم کرکے لکھا ہے، جو علم کی تحصیل میں اسپین اور افریقہ سے شام، حجاز، عراق اور مصر گئے، اور پھر ان مقاموں سے افریقہ اور اسپین میں داخل ہوئے یہ علمی سفر طلبہ عموماً پیدل طے کرتے تھے، اور ان سفروں میں سینکڑوں میل چل لیتے تھے، مثال کے طور پر ابو حاتم رازی کو پیش کیا جاسکتا ہے، وہ کہتے ہیں:-

"میں نے سفر میں پہلے سات برس قیام کیا، اور ایک ہزار فرسخ سے زیادہ چلا، پھر میں نے فرسخ کو شمار کرنا چھوڑ دیا، اور بحرین سے مصر تک پیدل چلا، پھر وہاں سے رملہ پیدل آیا، اور اس کے بعد پیدل ہی طرطوس پہنچا، اس سفر میں میرے بیس سال پورے ہو گئے"[2]

حافظ ابو یوسف یعقوب بن سفیان فسوی نے تیس سال سفر میں گذار دیئے[3]،

حضرت ابو عبد الرحمٰن بقی بن مخلد قرطبی نے دو سو اسی شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا، لیکن اسکے باوجود ان کا بیان ہے کہ انھوں نے ہر استاد سے پیدل چل کر حدیث سنی ہے، یہ اساتذہ مختلف ملکوں اور شہروں کے تھے[4]،

امام بخاری نے سولہ سال کی عمر میں اپنے شہر کی حدیثیں سننے کے بعد علم کی طلب کے لئے سفر شروع کیا، باپ کا سایہ موجود نہ تھا، ضعیف ماں اور بہن اس طالب علم کی نگہداشت کیلئے اس کے ساتھ ہو گئیں، اور مختلف شہروں بلخ، بغداد، بصرہ، کوفہ، شام، عسقلان، دمشق اور مصر وغیرہ میں پہونچکر وہاں کے شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا[5]،

امام دارمی نے حرمین، خراسان، شام، عراق، اور مصر جاکر علم کی تحصیل کی[6]،

۱؎ جامع بیان العلم ص ۴۶، ۴۷، ۲؎ تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۶۴۶، ۳؎ ر ص ۱۶۰، ۴؎ ر ص ۲۰۴-۲۰۵، ۵؎ ر ص ۱۳۴، ۶؎ ر ص ۱۱۵،

اس زمانہ میں طالب علم علم کی طلب کے لئے سفر کرنے کا دلی شوق رکھتے تھے، حافظ ابوبکر بن ابراہیم اسماعیلی اپنی طالب علمی کے زمانہ کا واقعہ خود بیان کرتے ہیں کہ

"جب محمد بن ایوب رازی کی وفات کی خبر پہونچی تو میں رونے اور چیخنے لگا، اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، اور سر پر خاک ڈالنے لگا، یہ دیکھکر میرے گھر کے لوگ جمع ہوگئے، اور اس مصیبت کا حال پوچھا، میں نے کہا کہ محمد بن ایوب آخر وفات پاگئے، اور تم لوگوں نے مجھے ان کے یہاں تک پہونچنے سے باز رکھا، یہ سن کر لوگوں نے مجھے تسلی دی اور مجھے طلب علم کیلئے نکلنے کی اجازت دی، اور میرے ماموں کو میرے ساتھ کر دیا، اور میں شہر نسا حضرت حسن بن سفیان کی خدمت میں روانہ ہوگیا، یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب یہاں (اپنے چہرے کی طرف اشارہ کر کے) ایک بال بھی نہ تھا"[1]

حافظ ابو علی حسن بن صاحب ابن حمید شاشی متوفی ۳۱۴ھ خراسان کے شیوخ سے حدیث لکھنے کے بعد عراق، شام اور مصر کا سفر کیا[2]، حافظ محمد بن ابراہیم بن حیون اندلسی متوفی ۳۰۵ھ نے اندلس کے شیوخ سے پڑھنے کے بعد عراق، حجاز اور یمن آکر علم کی تحصیل کی[3]، حافظ ابوبکر محمد بن ابراہیم معروف بابن مقری نے تحصیل علم میں اصفہان، بغداد، موصل، حران، عسقلان، کوفہ، تستر، مکہ، بیت المقدس، دمشق، بیروت، عکا، رملہ، آذنہ، واسط، عسکر، حمص، رقہ اور مصر کی خاک چھانی، وہ کہتے ہیں، "میں نے مشرق و مغرب کا چار مرتبہ طواف کیا.... اور میں نے ابن فضالہ کے ایک نسخہ کی خاطر ستر مرحلے طے کئے اور وہ نسخہ اگر نان بائی کو دیا جاتا، تو اس کے بدلہ میں وہ ایک روٹی بھی نہ دیتا، .... میں صرف بیت المقدس دس مرتبہ گیا ہوں"[4]، حافظ ابن مفرج ابو عبداللہ محمد بن احمد قرطبی شہر قرطبہ میں تحصیل علم کرنے کے بعد مزید تحصیل کیلئے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ صفحہ ۱۶۱ [2] ،، ص ۳ ۔

[3] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۱۵ [4] ،، ص ۱۸۲ و ص ۱۸۳

روانہ ہوئے، طرابلس، مصر، دمشق، جدہ، صنعاء، زبید، اور بیت المقدس پہونچکر حدیث کی تحصیل کی[۱] حافظ ابو العباس احمد بن محمد رازی متوفی ۳۹۳ھ پیدائشی نابینا تھے تاہم انھون نے تحصیل علم کے شوق میں بخارا، نیشاپور، بغداد اور بلخ کا سفر کیا، اور یہاں کے شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا[۲] حافظ ولید بن بکر بن مخلد سرقسطی اندلس کے دور دراز مقام سے خراسان تک آئے، اور تحصیل علم میں مصروف رہے، اور دینور (ایران) میں ۳۹۲ھ میں وفات پائی[۳]، حافظ ابو زکریا عبد الرحیم بن احمد تمیمی بخاری متوفی ۴۶۱ھ، بخارا میں حدیث سننے کے بعد خراسان، شام، یمن، مصر، اور افریقہ کا سفر کیا[۴] حافظ محمد بن طاہر مقدسی بیت المقدس کے شیوخ حدیث سے پڑھنے کے بعد اس عہد میں جہاں علم کی خوشبو سونگھی، پاپیادہ دوڑے گئے، چنانچہ مشہور مقامات بغداد، مکہ، تنیس، دمشق، حلب، جزیرہ، اصفہان، نیشاپور، ہرات، جرجان، آمد، استراباد، بوشنج، بصرہ، دینور، رے، سرخس، شیراز، قزوین، کوفہ، موصل، مرو، حرمین، نہاوند، ہمدان، واسط، اہواز اور بسطام وغیرہ میں انھون نے شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا، اور جہاں گئے، وہاں نہ صرف پاپیادہ گئے، بلکہ کتابوں کا پشتارا بھی پیٹھ پر لادے رہتے، ان کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ وہ روزانہ ۲۰ فرسخ (۶۰ میل) پیدل چل لینے پر قادر تھے[۵]، ایک مرتبہ حافظ ابو عبد اللہ محمد بن عبد الواحد اصفہانی جن شہروں تک طلب علم میں پہونچے تھے ایک مرتبہ ان کے نام گنانے لگے، تو ایک سو بیس مقامات نکلے[۶]،

امام شعبی فرماتے ہیں:-

"اگر کسی شخص نے شام کے اس سرے سے یمن کے اوس سرے تک صرف اسلئے سفر کیا کہ وہ حکمت کا ایک کلمہ سن لے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس نے اپنا سفر ضائع نہیں کیا[۷]۔"

پھر خود فرماتے ہیں "میں صرف ایک حدیث کی طلب میں رات رات اور دن دن بھر چلا ہوں[۸]۔"

---

۱ تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۲۱۴، ۲ رر ص ۲۳۲، ۲۳۳، ۳ رر ص ۲۸۰، ۲۸۱، ۴ رر صفحہ ۳۵۱، ۵ رر جلد ۴ ص ۳۹ تا ۴۱، ۶ رر صفحہ ۵۳، ۷ مختصر کتاب العلم ص ۴۷، ۸ تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۴۸،

اس علمی سفر سے طالب علموں کو بڑا فائدہ یہ پہونچتا تھا، جیسا کہ ابن خلدون نے یہ تشریح کی ہے کہ تھوڑے زمانہ میں مختلف ملکوں کی سیاحت اور مختلف ملکوں اور شہروں کے علماء کی زیارت سے ان میں علمی بصیرت پیدا ہو جاتی تھی، وہ لکھتا ہے :-

"علم کی تحصیل کے لئے سفر کرنے اور مشائخ سے ملنے میں تعلیم میں کمال کا اضافہ ہوتا ہے کیونکہ انسان علم، اخلاق مذہب اور دوسری فضیلتوں کو کبھی تو تعلیم و تعلم کے ذریعہ سے حاصل کرتا ہے، اور کبھی نقل، تقلید، اور میل جول سے، لیکن جو ملکہ میل جول سے حاصل ہوتا ہے، وہ زیادہ قوی اور مستحکم ہوتا ہے"،

طالب علم پر تعلیمی اصطلاحیں بھی مشتبہ ہو جاتی ہیں، یہاں تک کہ بعض طالب علم یہ سمجھنے لگتے لگتے ہیں، کہ وہ علم کا جز ہیں، یہ شبہ علماء کے میل جول کے بغیر زائل نہیں ہو سکتا، کیونکہ اساتذہ کے تعلیمی طریقے مختلف ہوتے ہیں،

اس لئے متعدد مشائخ سے ملنے سے وہ ان مختلف طریقوں کو نفس علم سے الگ کرے گا، اور سمجھنے لگے گا، کہ یہ صرف تعلیمی طریقے ہیں، خود علم ان سے علحدہ چیز ہے، یہ اس کے لئے ہے جس کے لئے اللہ علم اور ہدایت کے راستے آسان بنا دے، اس لئے علم کی طلب میں فائدے حاصل کرنے، مشائخ، اور عام لوگوں سے مل جل کر کمال پیدا کرنے کے لئے سفر کرنا ضروری ہے"[1]۔

اس کے علاوہ علمی اور تعلیمی سفروں سے طالب علموں کو دوسرا فائدہ یہ پہونچتا تھا، کہ وہ گھر بار سے علحدہ ہو کر پورے سکون اور اطمینان سے علم کی تحصیل میں مصروف رہتے تھے چنانچہ قاضی ابن جماعہ نے طالب علموں

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۴۰،

کو اسی لحاظ سے سفر کرنے کا مشورہ دیا ہے، وہ لکھتے ہیں :-

"اور اسی لئے سلف علم کی طلب میں وطن سے بے وطن ہونا، خاندان، عزیز، اقارب، اور گھر بار کو چھوڑنا پسند کرتے تھے، اگر گھر بار کی فکر پڑھنے کے زمانہ میں طالب علم کے دل ودماغ پر چھائی رہی، تو اس کا دل علمی حقائق پر متوجہ نہ ہو سکے گا، کیونکہ اللہ نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے ہیں"[1]۔

دنیاوی تعلقات سے کنارہ کشی، پھر طالب علم کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا کہ وہ دنیا و مافیہا ہر چیز سے بے تعلق ہو جائے، تاکہ اسکو دماغی سکون اور ذہنی یکسوئی حاصل ہو، مثل مشہور ہے کہ

العلم لا يعطيك بعضه حتى	علم تمہیں اپنا بعض حصہ بھی نہ دیگا جب تک
تعطيه كله،	تم اسے اپنا سب کچھ نہ دیدو،

خطیب نے کسی دوسرے بزرگ کا یہ قول نقل کیا ہے،

اس علم کو وہی شخص پا سکتا ہے، جو اپنی دوکان بٹھا دے، اپنا باغ خراب کر دے، اپنے بھائی بندوں کو چھوڑ دے، اور اگر اس کا کوئی عزیز قریب بھی مرے، تو اس کے جنازے میں نہ جائے"،

حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے متعلق بیان کیا جاتا ہے، کہ جب وہ علم کی تحصیل کے لئے دلی تشریف لے گئے، تو والدین اور عزیز واقارب کے جو خطوط آتے، انھیں اس خیال سے نہ پڑھتے، کہ شاید کوئی بری خبر درج ہو، اور طبیعت علم کی تحصیل کی طرف سے اچاٹ ہو جائے[2]،

امام شافعی فرماتے ہیں :-

"اگر مجھے ایک پیاز بھی خریدنے کی زحمت اٹھانی پڑتی تو میری سمجھ میں کوئی علمی مسئلہ نہ آتا"۔

---

[1] تذکرۃ السامع ص ۷۰، ۷۱، [2] نزہتہ الخواطر، ص ۹،

بعض شیوخ اپنے شاگردوں کے کپڑے صرف اسلئے رنگوا دیتے تھے، کہ ان کے بار بار دھونے کی فکر جاتی رہے، جس کی وجہ سے علمی مصروفیت میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے،

اصل مدعا یہ ہو کہ طالب علم کے لئے پوری طرح دلی اطمینان اور ذہنی یکسوئی حاصل رہے، تاکہ اسکی تعلیمی مصروفیتوں میں خلل نہ پڑے۔[۱]

تجرد اس ذہنی یکسوئی اور دلی سکون کے لئے طالب علموں کو شادی نہ کرنے کا مشورہ دیا جاتا تھا، خطیب بغدادی کہتے ہیں:۔

"طالب علم کے لئے بہتر ہے، کہ وہ کنوارا رہے، تاکہ زوجیت کے حقوق اور معیشت کی طلب کی مشغولیتیں، اسے کمال کی طلب سے محروم نہ کردیں"۔

امام سفیان ثوری فرماتے ہیں:۔

"جس نے شادی کرلی، وہ سمندر میں کشتی پر سوار ہوگیا، اور اگر کوئی بچہ پیدا ہوگیا، تو اس کشتی میں سوراخ بھی ہوگیا"۔

اس کے بعد قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں:۔

"جو شخص شادی کرنے پر مجبور نہ ہو، اس کا شادی نہ کرنا بہتر ہے خصوصاً طالب علم کیلئے جس کی ساری پونجی، دل کے اطمینان اور بے فکری کی زندگی میں رکھی ہے"۔[۲]

فقر و فاقہ اور صبر و قناعت طالب علموں کے لئے قناعت پسندی ان کا بہترین جوہر تصور کیجاتی تھی، انھیں معمولی غذا، اور سادہ اور مختصر لباس میں بسر کرنے، اور اگر فقر و فاقہ کی نوبت آ جائے تو صبر و استقلال سے اسے برداشت کرنے کی تلقین کیجاتی تھی،

امام شافعی فرماتے ہیں:۔

---

[۱] احیاء العلوم جلد ۱ ص ۳۲، و تذکرۃ السامع ص ۷، ۱۰، و تعلیم المتعلم ص ۵، [۲] تذکرۃ السامع ص ۷۲،

"کوئی شخص اس علم کو ملک و دولت، عزت اور خودداری قائم رکھکر حاصل نہیں کر سکتا،

بلکہ جو شخص اپنی خودی مٹا کر اور تنگ حالی میں گذار کر علماء کی خدمت کی سعادت حاصل کریگا،

وہ کامیاب ہوگا، بلکہ یوں سمجھو علم کی طلب صرف نادار اور مفلس ہی کے لئے سازگار ہو سکتی ہے"[1]

امام مالک فرماتے ہیں:۔

کوئی شخص علم و دانش کے مرتبہ پر اس وقت تک نہیں پہونچ سکتا، جب تک اس پر فقر

اور فاقہ کی مار نہ پڑے، اور اسے وہ ہر چیز پر ترجیح نہ دے لے،

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:۔

"یہ امر (علم) اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتا، جب تک فقر و فاقہ کا مزا نہ چکھ لیا جائے"[1]

چنانچہ ائمۂ اسلام کے سوانح میں بہت سے ایسے واقعات ہیں کہ انھوں نے تکلیف اور تنگدستی

میں بسر کیا، اور صبر اور استقلال سے اپنی تعلیم جاری رکھی، ابن القاسم، حضرت ربیعہ بن سلمان کے متعلق

بیان کرتے ہیں، کہ

"ربیعہ علم کی طلب میں ناداری کی اس حد تک پہونچ گئے تھے، کہ انھوں نے اپنے مکان

کی چھت کی لکڑی فروخت کر ڈالی، اور یہانتک کہ وہ آبادی کے گھوروں پر سے منقی اور

کھجور کا فشرہ اٹھا کر کھاتے تھے"[2]

حافظ ابو محمد حجاج کی تحصیل علم کے زمانہ کا یہ واقعہ مشہور ہے، کہ جب وہ حافظ شبابہ کے یہاں

درس حدیث کیلئے گئے تو ان کی ماں نے انھیں سو کلچے پکا کر تھیلی میں دیدیئے، وہ روزانہ ایک کلچہ نکالتے

اور دجلہ کے پانی میں بھگو کر سد رمق کرتے، جب کلچے ختم ہو گئے، تو انھیں بھی استاد کا در چھوڑنا پڑا،[3]

حضرت بقی بن مخلد نے چقندر کے پتے کھا کر طالب علمی کا زمانہ کاٹا،[4]

---

[1] تذکرۃ السامع ص ۷۱، ۷۲، مختصر جامع بیان العلم ص ۴۹، ۵۰ و تذکرۃ السامع [2] مختصر جامع بیان العلم ص ۴۸،

[3] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ صفحہ ۱۳، [4] ، ص ۲۰۴،

حضرت ابو حاتم رازی نے طالب علمی کے زمانہ میں ایک مرتبہ کپڑے بیچ کر گذارا کیا، اور جب کپڑے بھی نہ رہے، تو دو دن فاقے کے گذر گئے[۱]،

ابو نصر فارابی کو طالب علمی کے زمانہ میں چراغ کا تیل میسر نہ تھا، چوکیداروں کے چراغ کے پاس بیٹھ کر پڑھتا تھا[۲]، اور ابو العلاء ہمدانی مسجد کے چراغ کی روشنی میں پڑھتے تھے[۳]،

مدرسہ نظامیہ بغداد کے علامہ وخشی کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے، وہ اپنی طالب علمی کے زمانہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں، :-

"میں عسقلان میں تھا، اور ابن مصحح وغیرہ سے حدیث سنتا تھا، میرے اخراجات میں تنگی ہوگئی، اور چند دن فاقے سے گذر گئے، انہی دنوں میں کچھ لکھنے بیٹھا، مگر بھوک کے غلبہ کی وجہ سے لکھ نہ سکا، تو ایک نان بائی کی دوکان کی طرف چلا گیا، اور اس کے قریب بیٹھا تاکہ روٹی کی خوشبو سونگھ کر کچھ تقویت حاصل کروں، اس کے بعد اللہ نے مجھ پر اپنی روزی کا دروازہ کھول دیا[۴]"

امام شعبی سے پوچھا گیا کہ انہیں علم کیونکر حاصل ہوا، تو فرمایا، :-

"اپنے اوپر اعتماد نہ کرنے، علم کے لئے سفر کرنے، گدھوں کی طرح صبر کرنے، اور کوے کی طرح صبح تڑکے اٹھنے سے[۵]"

کم خوری

طالب علموں کو کھانا کم کھانے کی ہدایت کی جاتی تھی، کیونکہ اس سے طبیعت ہلکی رہتی ہے، اور مطالعہ دیکھنے اور سبق یاد کرنے میں آسانی ہوتی ہے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ

"میں نے سولہ برس تک پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا"،

حضرت حسن سے مروی ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا،

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۴۷، [۲] عیون الانبیا ر جلد ۲ ص ۱۳۴ [۳] تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۱۲ [۴] ر ر جلد ۳ ص ۳۴۵ [۵] ر جلد ۱ ص ۱،

"غور و فکر نصف عبادت ہے، اور کم خوری عین عبادت"،

حضرت سہل تستری مبالغہ کے ساتھ کہتے ہیں،

"میں قیامت کے دن کھانا چھوڑنے سے بہتر نیکی کا کوئی دوسرا کام نہیں جانتا"

پھر فرمایا :-

"علم اور حکمت گرسنگی میں رکھے گئے ہیں، اور جہل اور عصبیت پر خوری میں"،

نضر بن شمیل کہتے ہیں، :-

"کوئی شخص علم سے اسوقت تک لذت نہیں پا سکتا، جب تک وہ بھوکا نہ ہو، اور علم کی محویت میں وہ بھوک کو بھول نہ جائے"

رزق حلال اور نوعیتِ غذا کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں طلبہ کو یہ خیال رکھنے کی ہدایت کیجاتی تھی، کہ جو چیزیں انھیں حاصل ہوں، وہ حلال کی کمائی کی ہوں، اسی طرح ایسی چیزوں کے کھانے سے پرہیز کریں، جو کند ذہنی پیدا کرتی ہیں، اور ایسی غذائیں کھائیں، جو ان کے دل و دماغ کو قوت بخشیں،

کم خوابی طالب علموں کو کم سونے کا مشورہ بھی دیا جاتا تھا، اگرچہ سونے کے لئے ۲۴ گھنٹوں میں سے ۸ گھنٹوں کی اجازت تھی، لیکن عملی طور پر اہل علم و طالب علم بہت کم سوتے تھے، اور رات کا بڑا حصہ تعلیم اور مطالعہ میں صرف کرتے تھے، بلکہ کبھی رات کی رات گذار دیتے تھے، زرنوجی کا بیان ہے، کہ

"امام حسن بن زیاد نے ۸۰ سال کی عمر پائی، جس میں چالیس سال ایسے گذار دیئے، کہ انکی پیٹھ بستر سے نہیں لگی"۔

امام محمد بن حسن کے متعلق بیان کیا جاتا ہے، کہ وہ رات رات بھر جاگتے تھے، اور پیالہ میں پانی

بھر کر رکھتے تھے، جب نیند آتی، تو منہ پر پانی کی چھینٹیں مار لیتے تھے، وہ راتوں کو جاگ کر مسائل حل کر لیتے اور فرماتے "یہ لذتیں شاہزادوں کو کہاں نصیب ہیں"؛ اور ان کے شاگرد قاضی اسد بن فرات نے بھی بیان کیا ہے، کہ امام محمد نیند سے ہشیار کرنے کے لئے ان کے منہ پر پانی کی چھینٹیں مارتے تھے،

ابو علی ابن سینا کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ وہ پوری رات کبھی نہیں سویا، اور نہ دن کا بڑا حصہ مطالعہ کے سوا کسی دوسرے کام میں لگایا،[1]

وقت کی قدر و قیمت علمائے اسلام وقت کی بڑی قدر کرتے تھے، اور شاگردوں کو اسکی تلقین کیا کرتے تھے، امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں :-

"میں ان وقتوں کے کھونے پر افسوس کرتا ہوں، جو علم سے بے تعلق ہو کر کھانے پینے میں صرف ہوتے ہیں، ہمیں وقت اور زمانہ بیحد عزیز ہے"[2]

نظام اوقات طالب علموں کے لئے یہ ضروری تھا، کہ وہ اپنے دن رات کو چوبیس ۲۴ گھنٹوں میں اس طریقہ سے تقسیم کریں، کہ جس وقت جس قسم کا تعلیمی مشغلہ مناسب ہو انجام پائے، مثلاً صبح نور کے تڑکے حفظ کیلئے مقرر تھا، صبح سبق کی تکرار اور بحث کے لئے، دن چڑھے کتابت کے لئے اور شب مطالعہ اور مذاکرہ کے لئے، بعض لوگ اس سے کسی قدر مختلف نظام اوقات بھی بیان کرتے ہیں،[3]

غیر سودمند صحبتوں سے اجتناب طالب علموں کو عام معاشرتی زندگی کی چہل پہل سے دور رہنے کا مشورہ دیا جاتا تھا، خصوصاً انھیں غیر جنسوں کی صحبتوں سے علیحدہ رکھا جاتا تھا، وہ صرف انہی لوگوں سے ملتے جلتے جن سے یا تو وہ خود فائدہ اٹھاتے، یا ان سے فائدہ اٹھایا جاتا، بلکہ اگر طالب علم کسی صحبت میں کسی علمی فائدہ کی امید میں شریک ہوتے، اور اون کی توقع اس سے پوری نہ ہوتی، تو چند دنوں کے تجربہ کے بعد اس سے

---

[1] تذکرۃ السامع ص ۵، تا ۱۰، [2] طبقات الشافعیہ جلد ۲ ص ۳، وتعلیم المتعلم ص ۵۰، ۵۱، ۵۲، [3] تذکرۃ السامع ص ۲، ۳، ۷،

قطعِ تعلق کر لیتے تھے۔[۱]

حفظانِ صحت کا خیال طالب علموں کو حفظانِ صحت کے اصولوں کی تلقین کیجاتی تھی صحت کے لئے مضر غذاؤں کے استعمال سے روکا جاتا، اور صحت بخش غذائیں اور دوائیں انھیں بتائی جاتی تھیں، اگر وہ شادی شدہ ہوتے، تو فریضۂ زوجیت کی ادائی میں اعتدال رکھنے کی ہدایت کیجاتی تھی، اسکی کثرت کے نقصانات سمجھائے جاتے تھے، نزہت گاہوں میں سیر کرائی جاتی، خصوصًا صحت کی بقا، اور جسم کی ریاضت کیلئے چہل قدمی کے معمول بنا لینے کی ہدایت کیجاتی تھی، قاضی ابن جماعہ نے ان میں سے ہر ایک کو علٰحدہ علٰحدہ تفصیل سے لکھا ہے۔[۲]

استاذ کی صحبتوں میں نشست، طالب علم استاد کے درس کے حلقہ میں حاضر ہونے کے علاوہ اسکی دوسری مجلسوں میں شریک رہتے تھے، اور اس کی گفتگوؤں سے علمی فائدے حاصل کرتے، مذاکروں میں تہذیب اور ادب سے حصہ لیتے، اور ان مجلسوں سے واپس آکر کار آمد باتیں لکھ لیتے تھے، اگر ان مجلسوں میں کوئی شریک نہ ہوسکتا، تو وہ اپنے ان ساتھیوں سے مذاکروں کا حال دریافت کرتا جو ان مجلسوں میں شریک رہے ہوں، نیز مجلس کے برخاست ہونے کے بعد وہ باہم ان مسئلوں پر تبادلۂ خیالات کرتے تھے، طالب علموں کو ان مذاکروں سے بڑے فائدے پہونچتے تھے،[۳]

مذاکرہ اور تکرار طالب علم آپس میں بھی علمی مذاکرے کرتے تھے، جریر کہتے ہیں، کہ "ان کے ساتھی اَعمش کے درس کے حلقہ سے اٹھنے کے بعد ان کے مکان پر اکٹھا ہوتے تھے، اور ان سے مذاکرہ کے بعد اَعمش کے حلقہ کی تمام حدیثیں لکھ لیتے تھے"

مذاکرہ کا اسقدر اہتمام تھا، کہ اگر دو طالب علم بھی جمع ہوتے، تو مختلف مسئلوں پر مذاکرہ کرتے، اور اگر دو جمع نہ ہوسکتے، تو طالب علم کو رات کی تنہائی میں فرضی طور پر کسی کو موجود قرار دیکر اس سے کسی علمی

۱؎ تذکرۃ السامع ص ۸۳ ۲؎ ص ۷۲، ۷۴، ۷۶، ۷۹، ۸۰ ۳؎ ص ۱۴۲،

مسئلہ پر مذاکرہ کرنے کا مشورہ دیا جاتا تھا، وہ خود سوال کرتا، اور اس کے تشفی بخش جواب اپنے ہی ذہن سے حاصل کرتا، چنانچہ قاضی ابن جماعہ نے طلبہ کو یہی مشورہ دیا ہے،[1]

مختلف علماء کے سوانح میں ان کے طالب علمی کے زمانہ میں ان کے مذاکروں کے حالات ملتے ہیں،

امام ابو یوسف کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ وہ فقہ کے مسائل پر بڑی توجہ سے فقہاء سے مذاکرہ کرتے تھے، امام اعظم رح مذاکرہ کا سلسلہ اپنی دوکان ہی پر جاری رکھتے تھے، اور کہا جاتا ہے، کہ انھوں نے علم فقہ میں اسی کے ذریعہ سے جلا پیدا کی تھی،[2]

ابو بکر خطیب بغدادی کہتے ہیں، کہ "میں برقانی کے ساتھ حدیثوں کا کثرت سے مذاکرہ کرتا تھا، وہ اسے لکھ لیتے، اور اپنے مجموعہ میں شامل کر لیتے تھے"[3]

درس کے خالی وقتوں میں طالب علم سبق کو آپس میں مل کر دہراتے تھے، اور اسے تکرار کہتے تھے، اوس سے بہت سی باتیں جو ایک طالب کو یاد نہ رہ جاتی تھیں وہ دوسرے طالب علموں سے یاد آجاتی تھیں

کتابوں کی تعظیم طالب علم کتابوں کا بڑا احترام کرتے تھے، کیونکہ علم کی تعظیم یہ بھی تھی، کہ کتاب کی تعظیم کیجائے شمس الائمہ حلوائی فرماتے ہیں:۔

"میں نے یہ علم تعظیم سے حاصل کیا، میں نے کبھی کوئی کاغذ پاکی کے بغیر ہاتھ میں نہیں لیا"

طالب علموں کو کتاب کی طرف پیر پھیلانے سے منع کیا جاتا تھا، کتاب پر کوئی دوسری چیز رکھنے کی اجازت نہ تھی، یہانتک کہ دوات بھی رکھی نہ جاسکتی تھی، لیکن بعض علمائے نے اسکی اجازت دی ہے، کہ اگر کتاب کی توہین کا خیال نہ ہو تو ایسی چیزیں کتابوں پر رکھی جاسکتی ہیں، تاہم احتیاط اولیٰ ہے،[4]

طلبہ اور ان کی کتابیں طالب علموں کے تعلیمی مشاغل میں کتابوں کا نقل کرنا بھی تھا، اس زمانہ میں کتابوں کے حاصل کرنے کے چند ذرائع تھے، اگر طالب علم دولت مند ہوتے، تو کتابیں خریدتے یا اجرت دیکر نسخ کراتے، ورنہ کسی سے عاریۃً مانگتے، یا خود نقل کرتے،

[1] تذکرۃ السامع ص ۱۴۵، [2] تعلیم المتعلم ص ۱۸، [3] ابن عساکر جلد اص ۳۹۰، [4] تعلیم المتعلم ص ۲۶،

ان مختلف شکلوں کے لحاظ سے طالب علموں اور انکی کتابوں کے متعلق حسب ذیل اصول وطریق عمل جاری تھے

۱۔ دولتمند طالب علموں کو کتابیں خریدنے یا نسخ کرانے کا مشورہ دیا جاتا تھا، انھیں نہ خود لکھنے کی اجازت تھی، اور نہ کتابیں مستعار لینے کی،

۲۔ مستعار کتابوں پر کچھ لکھنا، حاشیہ چڑھانا، یا کوئی نشان بنانا تہذیب کے خلاف سمجھا جاتا تھا،

۳۔ کتابوں کے نسخ کرنے میں چند آداب مقرر تھے،

الف:۔ خط کے حسن وخوبی میں مبالغہ کرنے، اور نوک وپلک نکالنے میں وقت ضائع کرنے سے روکا جاتا تھا، صرف خط صاف ستھرا ہونا چاہئے تھا،

ب:۔ مذہبی کتابوں کے نسخ میں ذیل کے آداب ضروری تھے، جسم طاہر ہو، کپڑے صاف ستھرے ہوں، روشنائی پاک ہو، لکھتے وقت قبلہ کی طرف منہ ہو، اللہ تعالیٰ کے نام کے سامنے تعظیمی فقرے "تعالیٰ سبحانہ یا عزوجل" لکھے جائیں، آنحضرت صلعم کے نام مبارک کے آگے صلی اللہ علیہ وسلم لکھا جائے، صحابہ کے لئے "رضی اللہ عنہ" اور ائمۂ سلف کے لئے رحمہ اللہ تعالیٰ"

ج۔ سلف کے نزدیک مہین حروف میں لکھنا پسندیدہ نہ تھا، یہ مقولہ مشہور ہے کہ

"ایسا لکھو، کہ جب تمھارے پاس اسکی ضرورت کا وقت آئے تو وہ کام دے ایسا نہ لکھو کہ بوقت حاجت یعنی ضعیفی میں ضعف بینائی کے وقت وہ تمھارے کام نہ آئے"،

امام ابوحنیفہ نے ایک شخص کو مہین حروف میں لکھتے دیکھا تو فرمایا،

"باریک مت لکھو ورنہ اگر تم زندہ رہے تو تمھیں ندامت ہوگی، اور مروگے تو گالی سے یاد کئے جاؤ گے"

۴۔ کتابت کا آغاز بسملہ کے بعد حمد وصلوٰۃ سے کیا جائے،

۵۔ جزاور کتاب کے ختم پر خاتمہ کا نشان بنایا جائے،

۶۔ اگر کوئی عبارت مکرر ہو جائے، تو اسے قلمزد کرنے کے بجائے، اس سطر کے ذرا اوپر خط یا

نقطے دیئے جائیں،

۷۔ کتاب کے بابوں اور فصلوں کو سرخ روشنائی سے لکھا جائے، پوری کتاب کو سرخ روشنائی سے لکھنا پسند نہیں کیا جاتا تھا،

۸۔ دوسطروں کے درمیان کی جگہ میں نہ لکھا جائے،

۹۔ تصحیح شک وسوال اور کلام کے خاتمہ وغیرہ کی مقررہ علامتیں کتاب میں لکھی جائیں،

۱۰۔ کتابت کی تاریخ کو ضبطِ تحریر میں لایا جائے،

۱۱۔ الماری میں کتابیں علوم کی تقسیم، اور ان کی اہمیت کے اعتبار سے اوپر نیچے رکھی جائیں، اسی طریقہ سے روشنائی اور قلم بنانے، اور چاقو کے مناسب طور پر استعمال کرنے کے طریقے بتائے جاتے تھے۔ ناموں اور لفظوں کے حروف کو ضبط میں لانے، غلط کتابت کی تصحیح کرنے، اصل متن پر حواشی بڑھانے کوئی اعتراض وارد کرنے یا شک رفع کرنے، کتابوں کے مطالعہ کے وقت انھیں مناسب طریقہ سے سامنے رکھنے وغیرہ کے آئین اور آداب مقرر تھے، جنھیں قاضی ابن الجماعہ نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔[1]

استاذ کی اطاعت

شاگرد کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ استاذ کا کامل مطیع اس طریقہ سے ہو جیسے ایک مریض ماہر طبیب کے آگے ہوتا ہے، اسے ہر وقت استاد کے چشم وابرو کے اشارے پر چلنے کے لئے تیار اور اس کی ہر قسم کی خدمت گذاری پر مستعد رہنا چاہیے، حضرت ابن عباسؓ اپنی بزرگی اور مرتبہ کے باوجود حضرت زید بن ثابتؓ انصاری کی رکاب پکڑ کر چلتے، اور فرماتے تھے، کہ ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم اپنے علمار کیساتھ ایسا ہی برتاؤ کریں، حضرت شعبہؒ کہتے ہیں، کہ میں نے جس شخص سے ایک حدیث بھی سُنی زندگی بھر اس کا غلام بنا رہا۔"

[1] تذکرۃ السامع از ص ۱۶۳ تا ۱۹۳،

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں، کہ

"میں اس شخص کا غلام ہوں جس نے مجھے ایک حرف بھی پڑھایا، اسے اختیار ہے، چاہے وہ مجھے بیچ دے، چاہے آزاد کرے، چاہے غلام بنائے رہے"[۱]

قاضی فخرالدین ارسانبدی مرو کے بڑے امام سمجھے جاتے تھے، بادشاہِ وقت ان کی یہ تعظیم کرتا تھا، وہ فرماتے ہیں کہ

"مجھے یہ منصب استاذ کی عزت کرنے سے حاصل ہوا ہے، میں اپنے استاد ابوزید دبوسی کی خدمت کرتا تھا، ان کا کھانا پکاتا، اور اس میں سے خود نہ کھاتا تھا"[۲]

خلیفہ ہارون رشید کا لڑکا اصمعی سے علم ادب پڑھتا تھا، ایک مرتبہ خلیفہ اصمعی کے مکان کی طرف سے گذرا، اور دیکھا کہ اصمعی وضو کرنے میں پاؤں دھو رہے ہیں، اور شاہزادہ پانی ڈال رہا ہے خلیفہ یہ دیکھ کر برہم ہوا، اور اصمعی سے کہا:۔

"میں نے اس لڑکے کو تمھارے یہاں ادب سیکھنے کے لئے بھیجا ہے، تم اپنا پاؤں اپنے ہاتھ سے کیوں دھو رہے ہو، اس سے دھلانا چاہئے تھا، ایک ہاتھ سے پانی ڈالتا، دوسرے سے پاؤں دھوتا"[۳]

استاد و شاگرد کی باہمی معاشرت اور استاذ کے ادب و احترام کے آئین و طریق

قاضی ابن الجماعہ نے ایسے آداب اور آئین جنھیں اسلامی نقطۂ نظر سے شاگردوں کو اپنے استاذ کے ساتھ معاشرتی زندگی میں برتنا چاہئے تفصیل سے بیان کئے ہیں، ان سے اسلامی عہد میں استاد و شاگرد کی باہمی معاشرت پر روشنی پڑتی ہے، ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

۱۔ طالب علموں کا فرض ہے، کہ وہ استاذ کو عظمت کی نگاہ سے دیکھیں، اور یقین رکھیں کہ

---

[۱] تعلیم المتعلم ص ۲۳ [۲] ر صفحہ ۲۴ و صفحہ ۲۵ [۳] ر صفحہ ۲

وہ کمال کے درجہ پر فائز ہے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ جب میں امام مالک کے سامنے کتاب کا ورق الٹتا تھا، تو ان کی ہیبت کی وجہ سے اس قدر آہستہ الٹتا، کہ وہ سننے نہ پاتے۔ "ربیعہ کہتے ہیں "کہ خدا کی قسم میں نے امام شافعی کے سامنے ان کی عظمت اور بزرگی کی وجہ سے کبھی پانی پینے کی جرات نہ کی،

۲۔ اگر استاد کوئی حکم دینے میں غلطی بھی کرے، تو اسے صواب سمجھ کر تسلیم کر لینا چاہیے، حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کے قصہ میں اس کا اشارہ موجود ہے،

۳۔ استاذ کو کسی عام خطاب سے مخاطب کرنے کے بجائے "یا سیدی" یا "یا استادی" وغیرہ سے مخاطب کرنا چاہیئے، اور اس کی عدم موجودگی میں بھی اس کا نام تعظیمی الفاظ بڑھائے بغیر زبان پر نہ لانا چاہیئے، علمائے اسلام اپنے اساتذہ کیساتھ یہی ادب برتا کئے، خواہ اپنے علم و فضل کے بلند سے بلند درجہ پر بھی فائز ہو گئے ہوں،

۴۔ ہر مجلس میں استاذ کی عزت اور حرمت کا لحاظ رکھنا چاہیئے، اگر کسی موقع پر کوئی شخص اس کی شان میں ادب سے پیش نہ آئے، یا ناروا نکتہ چینی کرے، تو فوراً اپنی ناراضی ظاہر کر کے اس کی مدافعت کرنی چاہیئے، اور اگر غیظ و غضب کے ظاہر کرنے کا موقع نہ ہو تو اس مجلس سے اٹھ جانا چاہیئے

۵۔ علوم و فنون میں اس کے نظریوں اور خیالوں پر عبور رکھنا چاہیئے، انھیں دلنشیں رکھنے کی کوشش کرنا چاہیئے، اور اس کے مسلک کی پیروی کو اپنا شعار بنانا چاہیئے،

۶۔ اس کی عادتوں اور خصلتوں کی پیروی کرنی چاہیئے،

۷۔ اس کی زندگی میں اس کے لئے بھلائی کی دعا کرنی چاہیئے، اور اس کی وفات کے بعد اس کی قبر کی زیارت کر کے اس کے لئے مغفرت کی دعا مانگنی چاہیئے، اور اس کی اولاد اور عزیز و اقارب سے محبت اور تعظیم سے پیش آنا چاہیئے، کہ اصل میں یہ تعظیم اپنے استاد کی ہو گی،

ہدایہ کے مصنف شیخ الاسلام برہان الدین بیان کرتے ہیں، کہ امام بخاری کے شیوخ میں سے

ایک بزرگ درس کی مسند پر تشریف فرما تھے، ایک مرتبہ ان کی یہ عجیب و غریب کیفیت دیکھی گئی کہ وہ درس کے درمیان میں رہ رہ کر رک جاتے ہیں، اور پھر اضطراب سے کسی کی تعظیم کیلئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، ان سے اسکا سبب پوچھا گیا، تو انھون نے کہا،

"میرا استاذ زادہ بچوں کیساتھ گلی میں کھیل رہا ہے، وہ کھیلتے کھیلتے مسجد کے دروازہ پر آجاتا ہے، جب میری نظر پڑتی ہے، تو استاذ کی تعظیم کے خیال سے اون کے صاحبزادہ کی تعظیم کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہون" (تعلیم المتعلم)

۸- اگر استاذ کی طرف سے کوئی زیادتی یا سور خلقی ظاہر ہو تو اس کا کوئی اثر نہ لینا چاہیئے، اور اسکی وجہ سے اس کی صحبت میں جانے سے گریز نہ کرنا چاہیئے، بلکہ اس کے طرزِ عمل کی کوئی تاویل کر کے اپنے دل کو سمجھا لینا چاہیئے،

۹- استاد جو کچھ رشد و ہدایت کی راہ دکھائے، اس پر اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے،

۱۰- اگر استاد کسی وقت کوئی باریک علمی نکتہ بیان کرے، اور شاگرد اس سے پہلے سے آگاہ ہو تو بھی اسے پوری توجہ سے سننا چاہیئے، اور اس نکتہ کے مرحمت کرنے پر استاد کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے،

۱۱- استاد کے یہاں بغیر اجازت حاصل کئے نہ جانا چاہیئے، عام اس سے کہ وہ تنہا ہو یا کوئی دوسرا شخص اس کے پاس بیٹھا ہو، اگر استاد کسی وجہ سے اجازت دینے میں تامل کرے تو اجازت حاصل کرنے پر اصرار نہ کرنا چاہیئے لیکن اگر یہ شبہہ ہو کہ استاد کو اسکی آمد کی اطلاع نہیں ہوئی تو تین مرتبہ سے زیادہ اپنی اطلاع نہ کرائے، اگر اطلاع دینے کے لئے دروازہ پر کھٹکھٹانا ہو تو پہلے آہستہ سے انگلیوں کے ناخن سے کھٹکھٹانا چاہیئے، اگر اندر آواز نہ پہونچے، تو انگلیوں سے کھٹکھٹائے، اس کے بعد آہستہ آہستہ ہتھیلی مارے، اگر اس کے باوجود جواب نہ آئے تو لوٹ آنا چاہیئے،

۱۲- استاد کی خدمت میں صاف ستھرے کپڑے پہن کر جانا چاہیئے، اور حجامت بڑھی نہ ہو،

۱۳- اگر استاذ کے پاس پہونچکر معلوم ہو کہ وہ کسی کام میں مصروف ہے، تو وہاں پر خاموشی سے کھڑا نہ رہنا چاہیئے، بلکہ فوراً لوٹ آنا چاہیئے، اگر استاد اس کو روکنا چاہے گا، تو خود ٹھہرائے گا،

۱۴- استاذ سے پڑھنے پڑھانے کے لئے کسی ایسے وقت کا مطالبہ نہ کرنا چاہیئے، جو اس پر گراں گذرے،

۱۵- استاذ کے سامنے پورے ادب سے بیٹھنا چاہیئے، بیٹھنے میں تواضع انکسار اور خشوع و خضوع ظاہر ہو، اس کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے، دائیں بائیں بلا ضرورت نہ دیکھنا چاہیے، نہ ایسی حرکتیں کرنی چاہئیں جن سے استاذ کی توجہ ہٹ جائے، بعض لوگ بیٹھے بیٹھے اپنے کپڑوں سے کھیلنے لگتے ہیں، بعض ناخن چباتے ہیں، بعض اپنے ہاتھ داڑھی پر رکھتے ہیں، بعض لوگ داڑھی کے بال ناک میں لیجاتے اور نکالتے ہیں، بعض زمین پر لکیرین بناتے ہیں، یہ اور اس قسم کی تمام عادتیں آداب و تہذیب کے منافی ہیں، ان سے استاذ کے سامنے احتیاط لازم ہے،

۱۶- اسی طرح اوٹھنے بیٹھنے کے جتنے معلوم طریقے ہین، اون میں جو غیر مہذب اور بے تکلفی کے طریقے ہیں، انھیں استاد کے سامنے اختیار نہ کرنا چاہیے،

۱۷- استاذ کے سامنے بلا ضرورت کھانسنا تھوکنا اور ناک صاف کرنا برا ہے، اگر ضرورت پڑے تو مہذب طریقے سے کرنا چاہیئے، رومال سے صاف کرنا چاہیئے، اسی طرح بے تکلف ہو کر ہنسنا اور مسکرانا بھی ادب کے خلاف ہے، ان تمام عادتوں کے متعلق علمائے سلف کے بہت سے اقوال اور واقعات ہیں، جنکا یہاں تذکرہ کرنا طولِ عمل ہے،

۱۸- استاد کے پہلو سے پہلو ملاکر بیٹھنا روا نہیں، نہ اس کے سجادہ اور مصلی پر قدم رکھنا چاہیئے، نہ اس کے تکیہ سے ٹیک لگانا چاہیئے، البتہ اگر استاد حکم دے اور اصرار کرے تو حکم کی تعمیل میں کوئی مضائقہ نہیں،

۱۹- استاذ سے ہم کلام ہونے میں تہذیب اور ادب کا لحاظ رکھنا چاہیئے، "کیوں" "میں تسلیم

نہیں کرتا"، "یہ کہاں ہے"؟ یہ اور اس قسم کے فقرے ادب کے خلاف ہیں، انہی مطلبوں کو مناسب لفظوں میں تہذیب سے ادا کرنا چاہئے،

۲۰۔ اگر استاد کسی مسئلہ میں ایسی دلیل دیتا ہو اور اس پر اصرار کرتا ہو، جسے شاگرد کا دل قبول نہ کرے، تو بھی اصرار کی صورت میں خوشی سے اسے قبول کرلینا چاہئے،

۲۱۔ اگر استاد کی شان میں کسی دوسرے نے کوئی نا ملائم بات کہی ہو، تو اسے استاد کے سامنے "نقل کفر کفر نہ باشد" سمجھ کر بلا تکلف دہرانہ دینا چاہئے، بلکہ اس مفہوم کو اشارہ اور کنایہ ہی سے ادا کرنا چاہئے،

۲۲۔ استاد سے کسی مسئلہ یا سوال وجواب میں رد وکد نہ کرنا چاہئے، اگر وہ کسی بات کے متعلق کہے، کہ "کیا تم نے ایسا نہیں کیا تھا"؟ یا "تمہارا یہ مقصد نہ تھا" تو اس کے جواب میں فوراً تردید کے لئے تیار نہ ہو جانا چاہئے، بلکہ خاموش رہے اور اگر سوال کا جواب باصرار مانگا جائے، تو تہذیب کے ساتھ لطیف انداز میں اپنا مافی الضمیر بیان کردے،

۲۳۔ استاد کے کلام کے سلسلہ کو بیچ سے نہ توڑنا چاہئے، اور نہ اس کی گفتگو کے درمیان اپنی جماعت کے کسی دوسرے شخص سے باتیں کرنی چاہئے،

۲۴۔ استاد کے سامنے اپنا ذہن حاضر رکھنا چاہئے، اگر وہ کسی کام کا حکم دے یا کسی بات کے متعلق کچھ دریافت کرے، یا کسی جانب کوئی اشارہ کرے، تو فوراً امتثال امر کے لئے تیار ہو جانا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ غفلت میں اس کی طرف دھیان نہ رہے، اور اسے اپنی بات کے دہرانے کی ضرورت پڑے،

۲۵۔ اگر استاد کوئی چیز طالب علم کی طرف بڑھائے، تو اسے داہنے ہاتھ سے فوراً لینا چاہئے، اگر وہ کوئی تحریر ہو تو اسے فوراً پڑھنا چاہئے، اگر استاد اوراق کا کوئی مجموعہ دینا چاہے، اور اس کے

پڑھنے کے وقت اس کے اوراق پریشان ہوگئے ہوں، تو بڑھ کر اسی حالت میں استاد کے ہاتھ سے لے لینا چاہئے، استاد کے ترتیب دینے کا انتظار نہ کرنا چاہئے، بلکہ لیکر خود مرتب کرنا چاہئے، اور اگر وہ کسی کتاب میں کوئی چیز پڑھنے کے لئے بڑھائے، اور وہ کتاب کسی صفحہ پر کھلی ہوئی ہو، تو اسی طرح پڑھکر اسی کھلے ہوئے صفحہ کے ساتھ واپس کرنا چاہئے،

۲۶- استاذ سے اس قدر قریب نہ ہونا چاہئے، کہ اس کے کپڑوں سے چھو جانے کا اندیشہ ہو اور نہ اس کے سامنے کچھ دیکھنے کے لئے اس قدر جھکنا چاہئے، کہ اس کے پہلو سے مس ہو جانے کا اندیشہ ہو، یہ حرکتیں ادب کے خلاف ہیں،

۲۷- جب استاذ مجلس سے اٹھ کر جانے کے لئے تیار ہو، تو اس کی جانماز اٹھاکے، اور اس کے جوتے سیدھے کرنے کے لئے عجلت کے ساتھ بڑھنا چاہئے، بشرطیکہ استاد کو یہ ناگوار نہ گذرے، اور اس فعل سے اللہ کے نزدیک تقرب اور استاذ کے دل میں جگہ پانے کی نیت رکھی جائے،

۲۸- اگر استاذ کے ساتھ راہ چلنے کا اتفاق ہو، تو ضرورت کے وقت شب میں اس کے آگے چلنا چاہئے تاکہ اس کے چلنے سے استاذ کے لئے راستہ صاف اور چلا ہوا معلوم ہو، اور دن کے وقت اس کے پیچھے چلنا چاہئے، لیکن اگر راستہ میں بھیڑ ہو، تو راستہ بنانے کے لئے آگے چلنا چاہئے، اگر رات کے وقت آگے جانے کا اتفاق ہو تو بار بار پیچھے مڑکر دیکھتے جانا چاہئے، کہ استاد بلا زحمت راستہ طے کر رہا ہے،

اگر استاذ راستہ میں کچھ باتیں کرے، تو اس کے دائیں جانب اور بعض لوگوں کے کہنے کے مطابق بائیں طرف اس سے تھوڑے فاصلہ پر پیچھے رہ کر اس کی باتیں سنے، استاذ کے پہلو بہ پہلو صرف ضرورت ہی کے وقت چلنا روا ہو سکتا ہے، یا اس نے خود اشارے سے اپنے ساتھ چلنے کے لئے بلا لیا ہو اس صورت میں مونڈھے اور ہاتھوں کو استاذ کے جسم سے چھو جانے سے بچائے، اور اگر گرمی کا

زمانہ ہو تو اس طریقہ سے چلنا چاہیئے، کہ اس کا سایہ استاد کے جسم پر پڑے، اور اگر جاڑے کے دن ہوں، تو یہ لحاظ رہے کہ دھوپ اس کے جسم پر لگے، اگر استاد راستہ میں کسی دوسرے شخص سے باتیں کرنے لگے، تو اس قدر پیچھے ہو جانا چاہیئے، کہ اس کی باتیں نہ سن سکے، اور اگر قرینہ سے یہ معلوم ہو کہ اس گفتگو میں وہ شریک سمجھ رہا ہے، تو جو پہلو استاد کے مخاطب سے خالی ہو، اس پہلو پر آجانا چاہیئے،

۲۹- اگر استاذ راہ میں ملجائے تو اسے عجلت سے سلام کرنا چاہیئے، لیکن سلام دور سے کرنا مناسب نہیں، اسکے قریب سامنے آکر سلام کرنا چاہیئے،[1]

طلبہ میں تعلیم کا شوق اور جد و جہد

اس زمانہ میں طالب علموں میں تعلیم و تحصیل کا بڑا شوق تھا، سید شریف جرجانی کی طالب علمی کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ انھیں شرح مطالع کو اس کے مصنف سے پڑھنے کا شوق ہوا، چنانچہ وہ امام رازی کی خدمت میں پہونچے، مگر وہ ضعیف ہو چکے تھے پڑھانے سے معذور تھے، انھوں نے انھیں سفارشی خط دیکر اپنے شاگرد مبارک شاہ کے پاس قاہرہ بھیجا، مبارک شاہ نے انھیں حلقۂ درس میں صرف سماع کی اجازت دی مستقل درس اور قرأت کا موقع نہ دیسکے، چنانچہ ان کی تعلیم جاری ہو گئی، ایک مرتبہ رات کے وقت مبارک شاہ اپنے حجرے سے نکل کر مسجد کے صحن میں آئے، یہاں ایک طالب علم کو زور کی آواز میں یوں پڑھتے سنا، "مصنف نے یوں کہا، شارح یہ کہتا ہے، اور میں یہ کہتا ہوں" معلوم ہوا یہ سید شریف جرجانی ہیں، استاد کو طالب علم کی یہ محنت اور شوقِ طلب پسند آیا، اور دوسرے دن انھیں حلقۂ درس میں سب طالبعلموں پر مقدم کر دیا،[2]

---

[1] تذکرۃ السامع از ص ۸۷ تا ۱۱۲، اسی قسم کے آداب امام غزالی نے احیاء العلوم جلد اص ۳۲ تا ۳۵ میں اور زرنوجی نے تعلیم المتعلم میں اجمال کیساتھ بیان کئے ہیں [2] الشقائق النعمانیہ برحاشیہ ابن خلکان جلد اص ۱۶۷، ۱۶۸،

شیخ ابو علی ابن سینا کا بیان ہے، کہ انھوں نے طالب علمی کے زمانہ میں کتاب مابعد الطبیعیہ پڑھنی شروع کی، مگر سمجھ میں نہ آئی، سمجھنے کے لئے اسے بار بار پڑھتے، مگر مفہوم واضح نہ ہوتا، یہانتک کہ چالیس مرتبہ اسے پڑھ ڈالا، اور کتاب ازبر ہو گئی، پھر اتفاق سے ایک دن بازار میں اسی فن کی ایک کتاب ہاتھ آگئی، اسے بھی بادل ناخواستہ خرید لیا، پھر دیکھا تو یہ ابو نصر فارابی کی تصنیف تھی، جس میں اس نے کتاب مابعد الطبیعیہ کے اغراض کی تشریح کی تھی، کتاب پہلے ازبر ہو چکی تھی، اس شرح نے مشکلات کے تمام پردے چاک کر دیئے،[۱]

کتاب الحماسہ کے شارح خطیب تبریزی کی طالب علمی کے زمانہ کا واقعہ ہے، کہ ایک مرتبہ وہ فن لغت میں ابو المنصور کی کسی کتاب کے مطالب حل کرنے کے لئے اپنے شہر کے کسی لغوی کے پاس پہونچے، اس نے کہا کہ ابو العلا معری کی طرف رجوع کرو، چنانچہ وہ تبریز سے معرہ روانہ ہو گئے، ابو العلاء معری سے مل کر اس کے مطالب حل کئے،[۲]

مشہور نحوی و لغوی اسود کے متعلق مشہور ہے کہ وہ طالب علمی کے زمانہ میں چہرے پر تیل مل کر دھوپ میں بیٹھ جاتا تھا تاکہ بدویوں سے ہم شکل ہو جائے، اور ان سے مل جل کر لغت کی تحصیل کر سکے، چنانچہ وہ نہ صرف اپنے فن میں امام، بلکہ اسی لقب اسود سے مشہور ہو گیا،[۳]

تعلیمی و علمی حمیت

اس زمانہ کے طالب علموں اور فارغ التحصیل طلبہ میں پوری تعلیمی و علمی حمیت پائی جاتی تھی، ابن جنی نحوی کا نام مشہور ہے، وہ تحصیل علم سے فارغ ہو کر درس دینے کے لئے بیٹھا، اتفاق سے اس کے حلقہ میں نحو کا مشہور امام ابو علی فارسی پہونچ گیا، اور کسی مسئلہ میں اس نے ابن جنی کی غلطی دیکھی، ابو علی صرف اس قدر کہہ کر اٹھ گیا زببت قبل ان تحصرم، تم انگور بننے سے پہلے منقی بن گئے یعنی ابھی گدرانے

---

[۱] عیون الانباء جلد ۲، ص ۴، [۲] وفیات الاعیان جلد ۲ ص ۳۳۴ [۳] نزہۃ الالباء ص ۳۷۴،

بھی نہ پائے تھے، کہ پختہ کار ہوگئے، یہ فقرہ ابن جنی کے دل میں کھپ گیا، اسی وقت دامن جھاڑ کر درس کی مسند سے اٹھ کھڑا ہوا، اور منزل منزل طے کرکے ابو علی سے جا ملا، اور زندگی بھر اس کا ساتھ نہ چھوڑا اور پھر خود امام فن کہلایا[1]

ایک دوسرے نحوی کسائی کا واقعہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ ایک غلط لفظ کسی محفل میں بول گیا، اسے ٹوکا گیا، جس سے اتنا متاثر ہوا کہ اسی وقت اس فن میں کمال حاصل کرنے کا تہیہ کیا چنانچہ نحو کے استاد خلیل بصری کے حلقہ میں داخل ہوا، یہاں تحصیل کرنے کے بعد اسے خیال ہوا، کہ جیسے خلیل نے اسے حاصل کیا ہے، وہ بھی حاصل کرے، چنانچہ بدوؤں سے ملنے کے لئے بادیہ پیمائی شروع کی، اور کمال حاصل کرکے امام فن کہلایا[2]

[1] نزہتہ الالباء ص ۴۰۰ [2] ایضاً،

(۶)

حلقۂ درس

اساتذہ کا ورود حلقہ درس میں

اسلامی عہد کے درس کے حلقوں (کلاسس) کا نظارہ ذیل کے بیان سے ہوگا، جسے قاضی ابن جماعہ نے اساتذہ وطلبہ کے آداب میں بیان کیا ہے،

اساتذہ درس کے حلقہ میں جانے کے لئے اہتمام کرتے تھے، جیسے حلقہ میں صاف ستھرے اور اچھے کپڑے پہن کر اور خوشبو لگا کر آتے تھے، امام مالک کا یہ معمول تھا، کہ وہ جب حلقہ میں جانے کا تہیہ فرماتے، تو پہلے غسل کرتے، پھر اچھے کپڑے پہنتے، خوشبو لگاتے، اس کے بعد درس کے حلقہ میں تشریف لیجاتے،

اساتذہ روانگی سے پہلے خیر و برکت حاصل کرنے اور ضلالت اور گمراہی سے محفوظ رہنے کے لئے یہ دعاء ماثورہ پڑھتے تھے، اللّٰھُمَّ انی اعوذبک ان اضلّ او اضلّ واذل او اذل اظلم او اظلم اجہل او اجہل علی،[۱]

پھر ذکر الٰہی کرتے ہوئے درس کی مجلس میں آتے، اور مجلس کے حاضرین کو سلام کرتے، یہاں پہونچکر اگر کوئی مکروہ وقت نہ ہوتا تو دو رکعتیں نماز پڑھتے اور نماز کے بعد خشوع وخضوع سے توفیق خداوندی حاصل کرنے اور لغزشوں سے بچنے کی دعا کرتے، اس کے بعد قبلہ کی طرف منہ کرکے مجلس کے سامنے بیٹھ جاتے،

اساتذہ کا طریق نشست

اساتذہ درس کے حلقہ میں جیسا کہ اوپر گذرا کسی اونچے مقام کرسی یا منبر پر بیٹھتے تھے، بعض لوگ جو مسجد کے صحن میں درس دیتے تھے، وہ کسی نیچی دیوار یا کسی مینار سے ٹیک لگا کر بیٹھتے

---

[۱] ابو داؤد جلد ۲ صفحہ ۲۰۰،

سے تھے، اور بیٹھنے میں کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کرتے تھے، جو اہلِ علم کی نشست کے وقار کے خلاف ہو،

غیر سنجیدہ حرکتوں سے اجتناب

حلقہ میں غیر سنجیدہ حرکتوں سے باز رہتے تھے، ہنسی مذاق یا مزاح نہ کرتے تھے[1]

سالم بن جنادہ، حضرت وکیع بن جراح متوفی ۱۹۷ھ کے متعلق کہتے ہیں :-

"میں وکیع کی معیت میں سات سال تک بیٹھا، لیکن میں نے انھیں نہ کبھی تھوکتے دیکھا، نہ کسی کنکری سے کھیلتے ہوئے پایا، وہ جب نشست سے بیٹھتے، پھر پہلو نہ بدلتے تھے، وہ ہمیشہ قبلہ رو ہو کر بیٹھا کرتے تھے"[2]

آغازِ درس،

درس کا آغاز کسی خوش الحان قاری کی تلاوتِ قرآن سے کیا جاتا تھا، اس کے بعد "مستملی ونقیب" اہلِ مجلس کو خاموشی اختیار کرنے کی ہدایت کرتے، اس کے بعد سب سے پہلے شیوخ بسملہ پڑھکر صلوٰۃ اور سلام بھیجتے، پھر وہ اور تمام حاضرین دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے، اس کے بعد استعاذہ، بسملہ اور حمد و صلوٰۃ نئے سرے سے پڑھکر درس کی تقریر جاری کرتے تھے،[3]

درس وافہام وتفہیم کا طریقہ

درس میں آواز نہ زیادہ بلند ہوتی، اور نہ زیادہ پست، بلکہ اتنی ہوتی کہ مجلس کے حاضرین اُسے آسانی سے سُن سکیں، اور آواز مجلس کے باہر نہ جانے پائے، مسائل کو ذہن نشین کرانے کے لئے عموماً جملوں کو تین مرتبہ دہراتے تھے، درس کے درمیان جہاں مسلسل بیان کی ضرورت ہوتی، تقریر مسلسل جاری رکھتے، جہاں امتیاز پیدا کرنا ہوتا، تو ٹھہر جاتے، اور جب گفتگو منقطع کرنے کی ضرورت ہوتی، منقطع کر دیتے، اثنائے تقریر میں اگر اسلام کے خلاف کوئی شبہہ وارد ہوتا، تو اسے بیان کرتے، مگر یہ پابندی رکھتے، کہ اس کا جواب بھی اسی مجلس میں شبہہ پیش کرنے کے بعد ہی بیان کر دیں، اور اگر جواب دینے کا موقع نہ ہوتا تو شبہہ کی تفصیل اور دلیل بیان کرنے کے بجائے صرف اشارہ کر کے تقریر ختم کر دیتے، اور اسکی تفصیل اور جواب کو دوسرے دن کے لئے اٹھا رکھتے تھے،

---

[1] تذکرۃ السامع ص ۳۱، ۳۲، [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ا ص ۲۸۲، [3] تذکرۃ السامع ص ۳۴، ۳۵،

درس کی تقریر نہ اتنی طویل ہوتی، کہ غیر ضروری باتیں چھڑ جائیں، اور نہ اس قدر مختصر، کہ طالبعلموں کی تشفی نہ ہو سکے[1] اساتذہ درس کے اثنار میں طالب علموں سے حسن تلطف سے پیش آتے تھے، مسائل کو ان کی سمجھ کے مطابق آسان کر کے بیان کرتے تھے، اور مسائل کی تمثیلات سے تشریح کرتے تھے[2] اور لوگوں کے سوالوں کا جواب علیحدہ علیحدہ دیتے تھے، اگر استاذ کوئی مسئلہ کسی کو سمجھاتا، اور گفتگو کے درمیان کوئی دوسرا طالب علم کوئی شبہہ پیش کرتا، تو گفتگو چھوڑ کر شبہہ پیش کرنے والے کو تسلی دیتے، کہ پہلے وہ اس شخص کی گفتگو ختم کرلیں تو اس کے شبہہ کو دور کریں گے، ربیع کہتے ہیں کہ امام شافعی کا بھی یہی طرزِ عمل تھا[3] اور اگر کوئی شخص غیر ضروری ردوکد کرتا، تو اسے تنبیہ کیجاتی تھی[4] جو لڑکے کچھ کہنا چاہتے، اور مفہوم ادا نہ کر سکتے تو استاد اُن کی مدد کرتا، اور خاص توجہ سے ان کا مافی الضمیر معلوم کر کے ان کی تشفی کرتا[5]

آزمائشی سوالات اور اثنائے درس میں طلبہ کی استعداد کا امتحان

اساتذہ درس کے درمیان طالب علموں سے آزمائشی سوالات کرتے تھے، اگر جواب مشکل ہوتا تو طلبہ کو ایک ایک ہفتہ تک کی مہلت دیجاتی تھی، کہ اس درمیان میں تیار ہو کر اس سوال کو حل کریں[6]

کبھی دوسرے طریقوں سے طالب علموں کی استعداد کا امتحان لیا جاتا تھا، ابنِ ابی حناجر یہ واقعہ بیان کرتے ہیں، کہ ایک مرتبہ وہ ایک جماعت کے ساتھ مشہور محدث محمد بن مصعب عرقسانی کے یہاں حدیث سننے کے لئے پہونچے، شیخ نے مکان سے برآمد ہو کر کہا ابھی ایک شعر زبان پر آگیا ہے، اگر تم میں سے کوئی بتادے، کہ یہ کس کا شعر ہے تو میں تین حدیثیں سناؤں گا، اس کے بعد شیخ نے وہ شعر پڑھا، ایک عراقی طالب علم نے آگے بڑھ کر اس شاعر کا نام بتایا، شیخ نے

---

[1] تذکرۃ السامع ص ۳۶ تا ۳۹، [2] رص ۵۱-۵۲، [3] رص ۵۳، [4] رص ۴۰-۴۱، [5] رص ۴۲، [6] رص ۵۳،

اسکی تصدیق کی، اور پوچھا اس کے بعد کونسا شعر ہے، طالب علم نے اس کے بعد کا دوسرا شعر سنایا، شیخ یہ سن کر خوش ہوئے، اور شعروادب میں امتحان لینے کے بعد حسب وعدہ حدیثیں انھیں سنائیں[1] نیز طلبہ کو جو چیزیں حفظ کرائی جاتی تھیں، اساتذہ ان میں سے بھی کبھی کوئی چیز کسی طالب علم سے امتحان کے طور پر پوچھ لیا کرتے، اور صحیح جوابوں پر ان کی ہمت افزائی کرتے تھے[2]

اگر کبھی طالب علم کے جواب سے خوشی ہوتی، اور اسکی کوئی ادا پسند آجاتی، تو اساتذہ طالبعلمون کو انعام بھی دیتے تھے، ابوعبید کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ امام محمدؒ کے پاس امام شافعیؒ اپنی طالب علمی کے زمانہ میں حاضر تھے، امام محمدؒ نے ان سے کوئی سوال کیا، امام شافعیؒ نے اسکا جواب دیا، اور جب امام محمدؒ نے اس جواب کی تصدیق فرمائی، تو امام شافعیؒ نے اسے لکھ لیا، امام محمدؒ کو امام شافعیؒ کا یہ شوق علم پسند آیا، اور خوش ہوکر سو درہم عطا کئے، اور فرمایا کہ تم پابندی سے آیا کرو، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مین نے ان سے ایک اونٹ کے بوجھ کی مقدار میں لکھا ہے[3]

پردیسی طلبہ پر شفقت اساتذہ اپنے درس کے حلقہ میں پردیسی طلبہ پر خاص شفقت کی نظر کرتے تھے، مجلس میں ان سے رعب دور کرنے اور ان کی دلدہی کے لئے ان سے مسلسل گفتگو کرتے اور رفتہ رفتہ وہ اجنبی طالب علم اپنے استاذ کی شفقت کے سایہ میں دوسرے ہم جماعت دوستون سے گھل مل جاتے تھے[4]، اور اساتذہ کو حلقہ کے ہر طالب علم کے نام النسب وطن اور ضروری حالات سے باخبر رہنے کی تلقین کیجاتی تھی،[5]

حلقۂ درس میں معاصر علماء کی شرکت اور اساتذہ کا برتاؤ انکے ساتھ جیساکہ اوپر گذرچکا، درس کے حلقہ میں شاگردون کے علاوہ استاد کے ہمعصر علماء بھی کبھی شرکت کرتے تھے، اور انھیں حق حاصل تھا، کہ وہ استاذ کی تقریر پر اپنے علم اور ادراک کے مطابق اعتراضات کرین، یا کسی مسئلہ میں استاذ کی رائے سے

---

[1] مختصر جامع بیان العلم ص۵۱ [2] تذکرۃ السامع ص ۵۱، ۵۴ [3] مفتاح السعادۃ جلد ۲ ص۱۰۹ [4] تذکرۃ السامع ص۱۲۳ [5] ص۱۲۱

اتفاق نہ ہو تو دلائل سے اس کا رد کریں،

اساتذہ بڑی خوشی سے اپنے درس کے حلقہ میں ان معاصرین کا استقبال کرتے، اور ان کے شبہوں اور اعتراضوں کے جوابات دیتے تھے، جب استاذ کسی عالم یا فقیہ کو اپنے حلقہ میں آتے دیکھتا، تو اس کی آمد کے انتظار میں اپنی تقریر روک دیتا تھا، جب وہ آکر بیٹھ جاتا، تو اس مسلسل تقریر کے پچھلے حصہ کے ضروری جزوں کو نئے سرے سے اجمال کے ساتھ بیان کر کے پھر اپنی تقریر آگے جاری کرتا، اگر آنے والا کوئی سوال کرتا تو اس کا جواب دیتا، اور اگر اس کا جواب اس کے علم میں نہ ہوتا، تو کج بحثی کرنے کے بجائے بلا تکلف اپنی لاعلمی ظاہر کرتا، اور آنے والا اس مسئلہ پر جو کچھ بیان کرنا چاہتا، بیان کرتا، معلوم کا "لا ادری" (میں نہیں جانتا) "ولا اعلم" (مجھے معلوم نہیں) کہنا انکی کم علمی کے بجائے عالی ظرفی پر محمول کیا جاتا تھا[1]،

اگر ان مجلسوں میں ایک سے زیادہ اہل علم جمع ہوتے، تو ایک دوسرے کے علم کا احترام کرتے تھے، امام اوزاعی سے ابو محمد سعید بن عبدالعزیز کی موجودگی میں اگر کوئی سوال کیا جاتا تھا تو فرماتے کہ "ابو محمد سے پوچھو"[2]۔

ترتیب حلقہ استاذ کی بلند کرسی کے دائیں بائیں اگر ضرورت ہوتی، تو مستملی اور معید کھڑے رہتے سامنے کی نشست پر آگے ممتاز علماء بیٹھتے، ان کے پیچھے اور دائیں بائیں شاگرد بیٹھتے تھے، ورنہ اگر موقع ہوتا، تو طالب علم عموماً ایک ہی رخ پر بیٹھتے تھے، تاکہ استاذ کی توجہ ایک سمت پر مبذول رہے[3]،

قرأت کی باری جب حلقہ میں کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، تو قرأت کی باری اس طالب علم کی ہوتی تھی، جو درجہ میں پہلے آتا تھا، خواہ آنے والا اس مدرسہ کا طالبعلم بھی نہ ہو، اگر دو طالب علم

[1] تذکرۃ السامع ص ۲۸ [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ا ص ۲۰۳ [3] تذکرۃ السامع ص ۱۳۱، ۱۵۰، ۱۵۱،

ساتھ آتے تو ان میں قرعہ ڈال کر فیصلہ کیا جاتا تھا، پہلے آنے والے کا یہ حق اخلاقی طور پر تسلیم کیا جاتا تھا، اگر وہ کسی ضرورت سے حلقہ سے اٹھ جانے پر مجبور ہوتا، تو اس کا حق زائل نہ ہوتا تھا، وہ واپس آکر پھر اپنی قرأت جاری کرتا تھا،

البتہ اگر کوئی خاص وقت حلقہ کے مستقل طلبہ کے لئے مقرر کردیا جاتا تو اس میں اجنبیوں کو یہ اجازت حاصل نہ ہوتی تھی،[۱]

آداب درس طالب علموں کے لئے درس کے حلقہ میں شریک ہونے کیلئے چند لوازم تھے، جن کی پابندی کرائی جاتی تھی، جیسے حلقہ میں استاذ سے پہلے حاضر ہوجائین، کیونکہ شاگردوں کو استادون کے آنے کا انتظار کرنا چاہیئے، نہ کہ استادون کو لڑکون کے آنے کا منتظر بنایا جائے،

حلقہ میں اچھے، صاف ستھرے اور سنجیدہ لباس پہن کر آئیں، شیخ ابوعمرو بن صلاح اس طالب علم کو حلقہ میں بیٹھنے سے روک دیتے تھے، جو عمامہ کے بغیر ٹوپی پہن کر آتا تھا،

طالب علم اپنی کتابیں حلقہ میں کسی اونچی چیز جیسے رحل پر رکھیں ورنہ ہاتھوں میں لئے رہیں،

کسی طالب علم سے اگر کوئی خلافِ ادب بات سرزد ہوتی، تو سوائے استاد کے کسی دوسرے کو ٹوکنے کی اجازت نہ تھی،

پھر حلقۂ درس میں وہ تمام آداب برتے جاتے تھے، جو معاشرتی مجلسوں میں ملحوظ رکھے جاتے تھے، مثلاً جب حلقہ میں پہونچتے، تو بلند آواز سے حاضرین کو سلام کرتے، حاضرین ایک دوسرے سے احترام سے پیش آتے تھے، ایک دوسرے کی تعظیم کرنے میں سبقت کرتے تھے، کسی کے آگے یا دو آدمی کے بیچ میں بیٹھنے سے احتراز کرتے تھے، جب کوئی حلقہ میں آتا، تو خندہ جبینی سے اس کا استقبال کرتے، کسی دوسرے کی قرأت کے درمیان اُسے ٹوکتے نہ تھے، اگر درس کے اثناء میں کسی سے گفتگو کرنی ہوتی تو

[۱] تذکرۃ السامع ص ۶۰

استاذ سے اجازت لیتے تھے، کسی طالب علم سے کوئی بات ادب کے خلاف سرزد ہوتی، تو صرف استاد اور مرتب اسے ٹوکتے، طالب علم ایک دوسرے کو ادب نہ سکھاتے، جو لوگ مجلس میں دیر سے پہونچتے، وہ آخر میں بیٹھ رہتے، اگر کوئی اٹھ کر جاتا تو اس کی جگہ پر قبضہ نہ کرتے، اسے خالی چھوڑ دیتے، سن رسیدہ اور افضل طالب علموں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے، اور انھیں موقع دیتے، کہ وہ استادوں کے قریب بیٹھیں، تاکہ ان کے سوال وجواب سے دوسروں کو فائدہ پہونچے، بلکہ ایسے شاگردوں کو استاذ خود آگے بلا لیتے تھے، مثلاً امام احمد بن حنبل، شیخ ابو عاصم ضحاک بن مخلد کے درس کے حلقہ میں شریک ہوتے تھے، ایک مرتبہ وہ حلقہ میں دیر سے آئے تو جگہ پُر ہو چکی تھی، شیخ نے انھیں دیکھ کر آگے بلایا، لیکن انھوں نے لوگوں کی گردنیں پھاند کر جانے میں تامل کیا، تو شیخ نے حلقہ میں وسعت پیدا کرا کر ان کے لئے راستہ بنوایا، اور وہ اس سے ہو کر شیخ کے قریب جا کر بیٹھے، درس کے شروع اور خاتمہ دونوں پر حمد وصلوٰۃ کے علاوہ شیخ اور کتاب کے مصنف کے لئے دعاے خیر کرتے تھے، اور شیخ درس کے خاتمہ پر چند پر نصائح کلمے طالب علموں سے کہتا تھا،[۱]

خاتمۂ درس قاضی ابن جماعہ نے طالب علموں کو درس کے خاتمہ پر یہ دعاے ماثورہ سبحانک اللّٰھم بحمدک ولا الٰہ الا انت استغفرک واتوب الیک فاغفرلی انہ لایغفر الذنوب الا انت پڑھنے کی ہدایت کی ہے، اور بعض اساتذہ اپنے درس کا خاتمہ زہد واخلاق کے چند پند ونصائح پر کرتے تھے، قاضی ابن جماعہ نے اساتذہ کو مشورہ دیا ہے، کہ وہ درس ختم کر کے تھوڑی دیر ٹھہر جائیں تاکہ طلبہ تہذیب اور شائستگی سے ان کے سامنے حلقہ سے نکلیں، اور باہر نکلنے میں باہم کشمکش نہ ہو، اس کے علاوہ جو لوگ پیدل جانے والے ہوں وہ چلے جائیں، تاکہ یہ بدنمائی نہ ہو کہ استاد سواری پر واپس جائے اور نادار طلبہ اور اس کے ہمعصر علما پیدل روانہ ہوں، اور جب حلقۂ درس خالی ہو جائے، تو استاذ اہی

---

[۱] تذکرۃ السامع ص ۳۹ و ۹۳ و ۹۶ و ۱۰۸ وغیرہ،

جگہ سے اوٹھے، اور یہ دعا پڑھ کر روانہ ہوجائے،

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ[۱]

(۷)

طریقۂ تعلیم و نصابِ درس

اسلامی مدرسوں اور درس کے حلقوں میں بڑے طلبہ کو نہ صرف علوم کے انتخاب کا اختیار حاصل تھا، بلکہ انھیں اپنے استادوں کے انتخاب کی بھی آزادی حاصل تھی، وہ جس استاذ کو پسند کرتے اس کے درس کے حلقہ میں شریک ہوکر تعلیم جاری رکھتے تھے،

اساتذہ کا انتخاب اساتذہ کے انتخاب میں انھیں چند امور کا مشورہ دیا جاتا تھا مثلاً ان کا فرض تھا کہ وہ خود دقتِ نظر سے مختلف استادوں کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اپنے لئے کسی کو منتخب کریں اس انتخاب میں اہلِ علم دوستوں اور اپنے ساتھیوں سے مشورہ کریں، اساتذہ کی علمی استعداد کے علاوہ ان کے زہد، تقویٰ، اور اخلاق پر بھی نظر ڈالی جاتی تھی، اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ کن کن مشائخ کے حلقۂ درس سے فیضیاب ہوئے ہیں، اس لئے اساتذہ کے ذاتی کمالات کے علاوہ ان کے شیوخ کی منزلت سے بھی ان کی منزلت ہوتی تھی،

استاد کے انتخاب کے بعد کم سے کم دو مہینے اس کے درس میں شریک ہونا ضروری قرار دیا گیا تھا تاکہ اس اثنا میں اپنی تشفی کے متعلق صحیح اندازہ ہوسکے، اگر طبیعت کو سیری نہ ہوتی، تو پھر اس حلقہ کو چھوڑ دیتے لیکن دو ماہ سے پہلے چھوڑنے کی سخت ممانعت کی گئی ہے، کیونکہ اس سے کم مدت میں کسی استاذ کے متعلق صحیح اندازہ لگانا دشوار ہے[۲]،

نوعمر طالب علموں کے لئے ان کے والدین اس فرض کو انجام دیتے تھے، اور اس مسئلہ میں

[۱] تذکرۃ السامع ص ۲۶، ۴۴-۴۵، [۲] تعلیم المتعلم

اپنے دوستوں اور بہی خواہوں سے مشورہ کرتے تھے، احمد بن سلمہ جو امام مسلم کے ساتھیوں میں سے تھے کہتے ہیں کہ ان کے والد نے انہیں قتیبہ کے درس کے حلقہ میں بھیجنے کے لئے اپنے بعض دوستوں کو صلاح و مشورہ کی خاطر کھانے پر مدعو کیا، کھانے کے بعد اس مسئلہ پر مشورہ کیا اور اسکے بعد انہیں قتیبہ کے درس کے حلقہ میں بھیجنے کا فیصلہ کیا[1]

تعلیم کے ماہرین نے اساتذہ کے انتخاب کے مسئلہ میں اس کی ممانعت کی ہے، کہ صرف کسی استاذ کی غیر معمولی شہرت سن کر اس کی طرف رجوع کیا جائے، اکثر غیر معروف معلّمین اور اساتذہ بڑی جانفشانی سے درس دیتے ہیں، اور ان کے حلقہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا امکان ہوتا ہے[2]

تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے

بچوں کی تعلیم قرآن مجید کے درس سے شروع کراتے تھے، پہلے بچپن میں اسے پڑھا کر زبانی یاد کراتے، پھر قرآنی علوم طلبہ کے ذہن نشین کراتے تھے، اسکے بعد دوسرے فنون کی تعلیم دیتے تھے، قاضی ابن الجماعہ لکھتے ہیں:-

"تعلیم کی ابتدا، اللہ تعالیٰ کی کتاب عزیز سے کرنا چاہئے، پہلے اُسے حفظ کیا جائے، پھر اسکی تفسیر اور دوسرے متعلق علوم میں مہارت پیدا کیجائے کیونکہ علم قرآن ہی تمام علوم کی بنیاد ہے، اور اُسے تمام علوم پر فضیلت و اہمیت حاصل ہے"[3]

ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ جو مختلف علوم میں بحر زخار تھے، فرماتے ہیں:-

"مجھے میرے والد نے اس وقت تک حدیث پڑھنے کی اجازت نہیں دی، جب تک میں نے قرآن مجید کو فضل بن شاذان سے ختم نہ کر لیا"[4]

ابن خلکان کا بیان ہے کہ

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۱،
[2] تذکرۃ السامع ص ۸۵-۸۶، و تعلیم المتعلم ص ۱۰ تا ۲۲، [3] تذکرۃ السامع ص ۱۱۲، ۲۱۳،
[4] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۴۲۸،

"رئیس ابو علی ابن سینا دس سال کی عمر میں علم قرآن کا ماہر ہو چکا تھا"[1]

ہندوستان کے علماء کے سوانح میں بھی اس کی تصریح ملتی ہے، کہ یہاں بھی پہلے قرآن مجید پڑھاتے، اس کے بعد دوسرے علوم شروع کراتے تھے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنے متعلق لکھتے ہیں:-

"اول از قرآن مجید بسابقۂ تعلیم فرمودند سبق در سبق ایشان می نوشتند، و من میخواندم"[2]

ابتداءً بچوں کی تعلیم قرآن مجید سے شروع اور اسے ختم کرائے بغیر کسی دوسرے علم کے شروع نہ کرنے کا رواج تھا، مگر آگے چل کر اس طرزِ عمل میں کسی قدر تبدیلی پیدا ہوئی، تعلیم کی ابتدا تو قرآن مجید ہی سے کراتے، لیکن بعض ملکوں میں اس کے ساتھ دوسرے علوم بھی شروع کرا دیتے تھے، ابن خلدون نے مختلف ملکوں کے طریقۂ تعلیم کو بیان کیا ہے، جسے مولینا عبدالسلام صاحب ندوی نے اپنے مقدمہ التربیۃ الاستقلالیہ میں نقل کیا ہے، اسکا اقتباس ذیل میں پیش ہے اس سے مختلف ملکوں کے طریقۂ تعلیم کا فرق ظاہر ہو گا، لکھتا ہے:-

"اہل مغرب بچوں کو ابتدا میں صرف قرآن پاک کی تعلیم دیتے تھے، اور اس کے ساتھ کسی دوسرے علم مثلاً حدیث، فقہ، اور شعر وغیرہ کو نہیں ملاتے تھے، بربر بھی انہی کے مقلد تھے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ اور لوگوں سے زیادہ قرآن مجید کے حافظ ہوتے ہیں"

اہلِ اندلس کا طریقہ یہ تھا، کہ قرآن پاک کیساتھ شعر، انشا پردازی، قواعد عربیت اور تجوید خط کی بھی تعلیم دیتے تھے، اور تجوید خط کا سب سے زیادہ لحاظ رکھتے تھے،

اہلِ افریقہ بھی اگرچہ قرآن پاک کی تعلیم کے ساتھ حدیث اور بعض دوسرے علوم کی تعلیم ملا دیتے تھے، لیکن قرآن مجید اور اس کے وجوہ قرأت کے ساتھ ان کو سب سے زیادہ اعتنا،

---

[1] وفیات الاعیان جلد ا ص ۱۹۱ [2] اخبار الاخیار ص ۲۹۱،

تھا، اور تجوید خط ایک ضمنی چیز تھی، انھوں نے یہ طریقۂ تعلیم اہلِ اندلس سے سیکھا تھا، اس لئے یہ اہلِ اندلس کے طریقۂ تعلیم سے زیادہ مشابہ تھے،

اہلِ مشرق بھی قرآن مجید کے ساتھ اور علوم کی تعلیم دیتے تھے، لیکن تجوید خط کے ساتھ ان کو خاص اعتنار تھا، اس کے الگ قواعد مقرر تھے، الگ معلم ہوتے تھے، مستقل طور پر اور صنعتوں کی طرح اس کی تعلیم بھی دیتے تھے، اور مکاتب کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اسکی تکمیل کیجاتی تھی،

طریقۂ تعلیم کے اس اختلاف کے نتائج بھی مختلف ہوتے تھے، مثلاً اہلِ مغرب اور اہلِ افریقہ نے چونکہ اپنی تمام تر توجہ قرآن پاک کی طرف مبذول کردی تھی، اس لئے ان میں کسی علم کا ملکہ نہیں پیدا ہوتا تھا، کیونکہ قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہے، کہ اس کے بیان کے اسلوب کا تتبع انسانی قدرت سے باہر ہے، اس لئے ان میں اس تعلیم سے عربیت کا ملکہ نہیں پیدا ہوتا تھا،

البتہ اہلِ افریقہ نے چونکہ اس کے ساتھ اور علوم بھی ملائے تھے، اس لئے ان میں انشا پردازی کا ملکہ کسی قدر پیدا ہوجاتا تھا،

لیکن اہلِ اندلس نے چونکہ تعلیم قرآن کے ساتھ شعر، انشا، پردازی اور عربیت کی تعلیم کو بھی ملا لیا تھا، اس لئے ان میں ادب اور لٹریچر کا نہایت عمدہ ملکہ پیدا ہوجاتا تھا"[۱]۔

ہندوستان میں بھی پہلے قرآن مجید پڑھاتے، پھر لکھنا سکھاتے، اس کے بعد ہر فن کی مختصر کتابیں مثل کافیہ، لب الالباب، ارشاد وغیرہ پڑھاتے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے

---

[۱] مقدمۃ التربیۃ الاستقلالیۃ بحوالہ مقدمہ ابن خلدون ص ۶۱۶-۶۱۷، ابن خلدون کی بعض عبارتوں کے ترجمے بھی مقدمۃ التربیۃ الاستقلالیہ سے منقول ہیں،

اپنے تحصیلِ علم کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں،:۔

"اوّل از قرآن مجید تمسابقہ تعلیم فرمودند بسبق درسبق ایشان می نوشتند، ومن می خواندم از قرآن ہمیں مقدار تعلیم کردہ ام، بعدازان باثر تربیت وشفقت ایشان چنان قوت بہم رسید کہ ہر روز قدرے از قرآن می خواندم، وہر مقدار کہ می خواندم پیش ایشان می گذرانیدم در دو سہ ماہ ختم قرآن تمام کردم،

"و درخط وسواد چنانچہ معلمان صبیانی اطفال را در مکتبہا یاد وہند مفید نہ شدند، فقیر را تا فاو قاف بر طریقۂ اطفال مفید شدہ نویسانیدہ باشند، بعدازاں بطریق اجمال در اندک مدت شاید اگر مقدار یک ماہ تعین کنیم، دروغ نگفتہ باشم، قدرت کتابت وسلیقہ انشا پیدا شد"

پھر ابتدائی تعلیم کی تفصیل بیان کر کے لکھتے ہیں،:۔

می فرمودند تو یک مختصر از ہر علم بخوان ترا پسندیدہ است بعدازان انشاء اللہ چنان ابواب برکت وسعادت بر تو کشاید، کہ جمیع علوم بے تکلف تحصیل روے نماید"[1]

ہر فن کی اہم کتابوں کو زبانی یاد کرنا

قرآن مجید کی تعلیم کے بعد دوسرے علوم شروع کرائے جاتے تھے، اور سب سے پہلے اہم علوم حدیث، اصول، صرف ونحو کے اہم مسائل اور مبادیات طلبہ کو حفظ کرادیئے جاتے تھے، اور اس کے ساتھ علم قرآن میں بصیرت پیدا کرنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا،[2]

معیاری کتابوں کے حفظ کیلئے سلاطینِ اسلام کے انعامات

علوم کے مبادی کے حفظ کرنے کا طریقہ بڑی پابندی سے رائج تھا، اور طالب علموں کی تعلیمی بنیاد کی استواری کے لئے یہ بیحد ضروری سمجھا جاتا تھا، اسی وجہ سے سلاطین اور امراء نے طلبہ کی ہمت بڑھانے اور شوق دلانے کے لئے مختلف معیاری کتابوں کے

[1] اخبار الاخیار ص ۲۹۰، ۲۹۱، [2] تذکرۃ السامع ص ۱۱۳،

برزبان کرنے کے لئے مستقل گرانقدر انعامات مقرر کر دیئے تھے، جس کی وجہ سے طلبہ ان کتابوں کے برزبان کرنے میں سبقت کرتے تھے، چنانچہ مصر کے بعض سلاطین نے امام محمد کی مشہور تصنیفات پر جو فقہ حنفی کی بنیادی کتابیں ہیں گرانقدر انعامات مقرر کئے تھے،[۱]

حفظ کا طریقہ

اساتذہ، طالب علموں کو حفظ کرنے کے طریقے بتاتے تھے، زرنوجی طلبہ کو ہدایت کرتا ہے، کہ

"طالب علم کو چاہیئے کہ وہ دل میں سبق کے بار بار دہرانے کا شمار کرتا جائے، آج کا سبق برزبان کر لینے کے بعد کل کے سبق کو پانچ مرتبہ، پرسوں کے سبق کو چار مرتبہ، اترسوں کا تین مرتبہ، اس سے پہلے کا دو اور اس سے بھی پہلے کا ایک مرتبہ پابندی سے دہرائے یہ طریقہ برزبان رکھنے کا سب سے بہتر ہے[۲]"۔

حفظ اخبار و سیر

طلبہ کو جو چیزیں حفظ کرائی جاتی تھیں، ان میں صحابہ، تابعین، خلفاء، ائمۂ اسلام، صالحین اور مشہور فقہاء کے نام اور ان کے مختصر حالات و سوانح بھی تھے، یہ انھیں املا کرا کر یاد کرائے جاتے تھے، تاکہ وہ علم اور مذہب کے ستونوں سے باخبر رہیں، لیکن ان اکابر کی ایک دوسرے پر باہمی فضیلت وغیرہ اختلافی مسئلوں پر مدرسہ میں بحث اور مناظرہ کی اجازت نہ تھی[۳]،

حفظ کتب

چنانچہ اسلامی مدرسوں کے طالب علم مختلف علوم و فنون کی چیزیں بہ کثرت حفظ کرتے تھے، ابن خلکان ابو علی بن سینا کے متعلق لکھتا ہے:-

"اس نے اصول دین، ہندوستانی حساب اور جبر و مقابلہ کی چند چیزیں حفظ کیں[۴]"۔

علامہ ذہبی فقیہ یونینی کے متعلق لکھتے ہیں کہ انھوں نے طالب علمی کے زمانہ میں پہلے قرآن یاد کیا، پھر لکھنا سیکھا، پھر حمیدی کی الجمع بین الصحیحین یاد کی، پھر چار مہینے میں صحیح مسلم برزبان کی اور ان

---

[۱] الدرر الکامنہ ابن حجر [۲] تعلیم المتعلم ص ۴۸ [۳] تذکرۃ السامع ص ۵۰ [۴] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۱۹۱،

کے جلد یاد کر لینے کی مثال یہ ہے، کہ انھوں نے سورۂ انعام صرف ایک دن میں یاد کیا، اور حریری کے تین مقامات ایک دن کے صرف بعض حصوں میں[۱] امام بخاری نے ۱۱ سال کی عمر میں علم حدیث کی تحصیل شروع کی، اور ابن مبارک کی کتابیں بچپن ہی میں یاد کر لیں[۲]

ابو بکر بن انباری نحوی کے متعلق ان کے شاگرد ابو علی قالی کا بیان ہے، کہ کہا جاتا ہے، کہ انھیں تین لاکھ اشعار صرف ایسے یاد تھے، جو قرآن مجید کی شہادت میں پیش کئے جا سکتے تھے[۳]

سیوطی ابن قتیبہ کے صاحبزادے ابو جعفر احمد قاضی مصر متوفی ۳۲۲ھ کے متعلق لکھتا ہے، کہ

"یہ علم اور حفظ والوں میں سے تھے، انھوں نے مصر میں اپنے والد کی تمام کتابیں اپنے حفظ سے تلامذہ کو پڑھ کر سنائیں، ان کے ساتھ کوئی کتاب نہ تھی، اور ابن قتیبہ کی کتابیں تعداد میں اکیس تھیں[۴]"

ہندوستان کے اہل علم میں حفظ کا رواج،

ہندوستان کے اہل علم میں بھی کتابیں حفظ کر لینے کا رواج تھا، شیخ عثمان ابن داؤد ملتانی متوفی ۷۳۶ھ کے متعلق سیر الاولیاء کے حوالہ سے نزھۃ الخواطر میں ہے،

"انھیں فقہ میں ہدایہ اصول میں بزدوی، اور قوت القلوب کی اور احیاء العلوم غزالی سلوک وتصوف میں بر زبان یاد تھیں[۵]"

بابا داؤد کشمیری متوفی ۱۰۹۷ھ کو مشکوٰۃ بر زبان یاد تھی، اسی نسبت سے مشکوٰتی مشہور ہوئے

تذکرۂ علمائے ہند میں ہے،:

"حافظ مشکوٰۃ المصابیح بود، بدین وجہ اورا مشکوٰتی می گفتند[۶]"

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۲۲۴، [۲] رر جلد ۲ ص ۱۳۴، [۳] رر جلد ۳ ص ۵۷، [۴] حسن المحاضرہ جلد ا ص ۱۵۶
[۵] نزھۃ الخواطر ص ۷۶، [۶] تذکرہ علمائے ہند ص ۶۰

محدثین کا حفظ حدیث علم حدیث کے طالب علم غیر معمولی طور پر حدیثیں برزبان کرتے تھے، امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ

"مین نے ہر وہ چیز برزبان کر لی، جو ہشیم سے ان کی زندگی میں سنی تھی"[۱]

امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں، کہ ایک مرتبہ میں مکہ جارہا تھا، راستہ مین ایک شیخ سے ملاقات ہوئی، ان کی روایتیں ایک دوسری سند سے میں نے حاصل کی تھیں، جو دو جزوں میں لکھی ہوئی تھیں، میں نے خیال کیا کہ یہ دونوں جزء ساتھ موجود ہین، انھین شیخ سے پڑھ لون، چنانچہ میں نے ان سے استدعا کی، اور وہ سنانے پر آمادہ ہوگئے، اب میں اپنے جزء نکالتا ہون، تو سادے صفحات تھے، میں انہی کو ہاتھ میں لیکر سننے لگا، اور شیخ اپنی حدیثیں سناتے گئے، اتفاق سے ان کی نظر سادے صفحون پر پڑ گئی، اور انھوں نے برہمی سے کہا تھیں شرم نہیں آتی میں نے کہا، ابھی جو حدیثیں آپ نے روایت کیں، وہ مجھے یاد ہوگئین، انھیں یقین نہیں آیا، اور خیال ہوا کہ وہ پہلے سے یاد ہون گی، میں نے کہا دوسری روایتیں سنائیے، میں سُنا دونگا، چنانچہ انھون نے چالیس روایتیں سنائیں، اور ان کے سوال پر میں نے سب انھیں اسی وقت دہرا دین، کہیں ایک حرف کی بھی غلطی نہیں ہوئی۔[۲]

داؤد بن یحییٰ حافظ ابو عبداللہ محمد بن علی قرطمہ کے متعلق کہتے ہین :-

"لوگ حفظ میں ابوزرعہ اور ابوحاتم کا نام لیتے ہیں، واللہ میں نے قرطمہ سے زیادہ کسی کو حافظ نہیں پایا، میں ایک مرتبہ ان کے یہان گیا، انھوں نے کہا یہ کتابیں رکھی ہیں، ان میں سے کوئی اٹھالو، اور میں پوری زبانی پڑھ دون، میں نے کتاب الاشربہ اٹھائی، اور انھوں نے اوّل سے آخر تک اُسے سُنا ڈالا"[۳]

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۰۱ [۲] رر جلد ۲ ص ۲۰۹ [۳] رر ص ۳۰۹

امام شعبی فرماتے ہیں کہ "مجھ سے جب کسی شخص نے حدیث بیان کی، تو اس کو میں نے حفظ کر لیا، میں جو کچھ سنتا ہوں اُسے حفظ کر لیتا ہوں"[۱]۔

امام عجلی سے پوچھا گیا کہ کیا ان کے پاس حدیثوں کے مجموعہ کی کوئی کتاب موجود ہے؟ تو انھوں نے فرمایا "میرا سفینہ میرا سینہ ہی ہے"۔ وہ بصرہ میں اپنے وقت کے حدیث کے سب سے بڑے حافظ تھے[۲]

اسباق میں طلبہ کی ذہنی استعداد کا لحاظ مبتدیوں کو اتنا سبق دیا جاتا جتنا وہ یاد کر سکتے تھے، زرنوجی اپنے مشائخ کا یہ قول نقل کرتا ہے، کہ "مبتدیون کو بس اسقدر سبق دینا چاہئے، جسے وہ دو مرتبہ کے اعادہ سے یاد کر لیں"[۳]۔

اس کے بعد جیسے جیسے طالب علم کی استعداد بڑھتی اسباق تدریجی طور پر بڑھاتے جاتے تھے، کسی طالب علم کو اس وقت تک کوئی چیز لکھنے کی اجازت نہ تھی، جب تک وہ اسے اچھی طرح ذہن نشین نہ کرلے، جب نئے طلبہ حلقہ میں آتے، تو شیخ ان کی ذہنی استعداد کا امتحان لیتا، ماہرین تعلیم نے اسکی ہدایت کی ہے[۴]،

علوم کی تعلیم میں یہ بھی ضروری سمجھا جاتا تھا، کہ ایک فن مین مہارت حاصل کرنے کے بعد دوسرے کو شروع کیا جائے، امام غزالی اور ابن خلدون نے اسے تفصیل سے بیان کیا ہے[۵]،

طرز تعلیم علامہ شبلی علیہ الرحمہ اسلامی نظام تعلیم کے دورِ اول میں طرز تعلیم کے متعلق فرماتے ہین:-

"اُس دور میں تعلیم کا مستند طریقہ وہی تھا، جو آج مہذب ملکون میں جاری ہے، یعنی املا جس کو اردو میں لکچر دینا کہتے ہیں، استاد ایک بلند مقام مثلاً کرسی یا منبر پر بیٹھ جاتا تھا، اور کسی فن کے مسائل زبانی بیان کرنا شروع کرتا تھا، طالب علم جو ہمیشہ دوات و قلم لیکر بیٹھتے تھے، ان تحقیقات کو استاد کے خاص لفظوں میں لکھتے جاتے تھے، اس طرح پر ایک مستقل کتاب تیار

۱۔ طبقات الشافعیہ سبکی جلد ۱ ص ۲۳۴ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۳۱ ۳۔ تعلیم المتعلم ص ۴۰ ۴۔ تذکرۃ السامع ص ۵۲ مع تذکرۃ السامع
۵۔ احیاء العلوم جلد ۱ ص ۳۴،

ہوجاتی تھی، اور امالی کے نام سے مشہور ہوتی تھی، امالی ابن درید اور ثعلب وغیرہ اسی قسم کی تصنیفات ہیں، جب معمول سے زیادہ طلبہ حلقۂ درس میں جمع ہوتے تھے تو استاد کے سامنے دائیں بائیں چند فاضل کھڑے ہوتے تھے، جو دور والوں کو استاد کے خاص الفاظ سنا سکتے تھے، یہ لوگ مستملی کہلاتے تھے، یہ طریقۂ تعلیم منقولی علوم کے ساتھ مخصوص نہیں تھا، ابو بشر متی جو بغداد میں ارسطو کی کتاب المنطق کا درس دیتا تھا، اس کے لکچر میں سینکڑوں طلبہ شریک ہوتے تھے، جن میں فارابی بھی تھا، اور اس نے کئی سو صفحے خود نقل کئے تھے"[1]

طلبہ املا و سماع کے وقت پورے طور پر متوجہ رہتے تھے، یہانتک کہ اگر وہ کسی مسئلہ میں لگ جاتے تو بھی توجہ ادھر سے نہ ہٹتی، امام دارقطنی کی طالب علمی کے زمانہ کا یہ حیرت انگیز واقعہ ہے کہ وہ اپنی کم سنی کے زمانہ میں اسمٰعیل صفار کی مجلس میں حاضر تھے، صفار حدیثیں سناتے جاتے، اور سماع میں شریک ہونے کے باوجود کوئی دوسری چیز لکھتے جاتے تھے، یہ دیکھ کر ایک ساتھی نے جھنجلا کر کہا تم لکھنے میں مصروف ہو تمہارا سماع جائز نہ ہوگا، دارقطنی کو بھی طیش آیا اور انہوں نے کہا کہ املا کیلئے میری سمجھ تمہاری سمجھ سے مختلف ہے، کیا تمہیں یاد ہے کہ شیخ نے کس قدر املا کرایا ہے؟ اس نے نفی میں جواب دیا، تو دارقطنی نے تفصیل بیان کرنی شروع کی کہ اٹھارہ حدیثیں لکھا چکے ہیں، پہلی حدیث عن فلاں عن فلاں تھی، اور اس کا متن یہ اور یہ تھا، دوسری حدیث عن فلان عن فلان ہے، اور اس کا متن یہ اور یہ ہے، اسی طریقہ سے اس وقت کی لکھائی ہوئی کل حدیثیں زبانی سنادیں، یہ دیکھ کر لوگوں کو حیرت ہوئی[2]

جب درس کے حلقہ میں مقرر کتابیں پڑھانے کا دستور ہوا، تو اس کے دو طریقے رائج تھے، بعض مرتبہ اساتذہ کتابوں کی قرأت کرتے تھے، اور شاگرد انہیں سنتے تھے، اور بعض حلقوں میں

[1] تذکرۃ السامع ص ۵۶ [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۲۰۰،

استاذ کے سامنے کتابون کی قرأت شاگرد کرتے تھے، اور استاذ انھیں سنتا، اور حسب ضرورت غلطی کے موقعوں پران کی تصحیح کرتا، اور مشکل مقاموں پر شبہے دور کرتا،

سندین ان مختلف طریقوں سے حاصل کئے ہوئے علم کی سندوں میں اعتبار اور استناد کے لحاظ سے درجے اور امتیاز قائم تھے، اور اسی لحاظ سے سندین دیجاتی تھیں، اور ان سندون کی مختلف قسمیں تھین، مثلاً ایک قسم کی سند اصطلاحاً "اجازۃ" کہلاتی تھی، یعنی شیوخ اپنے کسی شاگرد کو کسی کتاب کا کچھ حصہ پڑھا دیتے، اور اس کے باقی حصّوں کے پڑھنے کی اجازت اپنے کسی ایسے شاگرد کو دیتے، جسے وہ پہلے پڑھا کر سند دے چکے ہوتے، یا اس طالب علم کو خود بغیر کچھ پڑھائے ہوئے اپنے شاگردون کے زمرہ میں شامل ہونے کی اجازت دیکر اپنے کسی شاگرد سے اپنی کتاب کے پڑھنے کی اجازت دیدیتے تھے، اب وہ طالب علم پہلے فارغ التحصیل شاگرد سے اس کتاب کی "اجازت" کے طریق پر سند قرأت لیتا، جیسے امام شافعی کے سامنے ان کے ایک شاگرد زعفرانی نے کتاب الام بجز کتاب الصلوٰۃ والمناسک کے پوری پڑھی، اور کتاب الصلوٰۃ اور کتاب المناسک خود امام شافعی نے ان کے سامنے پڑھ دین، اس کے بعد امام شافعی بغداد پہونچے، یہان ایک دوسرے اہل علم کرابیسی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان سے کتاب الام کی کتابیں (ابواب) پڑھنی چاہیئں، لیکن امام شافعی نے ان سے فرمایا، کہ میں زعفرانی کو کتابین دیچکا ہون، ان سے حاصل کرلو میں تھین ان سے پڑھنے کی سند اجازۃ دیتا ہون[1]۔

طریق سماع واجازہ وقرأت کے فرقوں کا اندازہ حافظ ابن الفضل کے ذیل کے بیان سے ہوگا، وہ فرماتے ہیں،

"میں نے سلفی سے پوری صحیح بطریق اجازہ بذریعہ ابو مکتوم ابن ابی ذرسنی، اور ہمارے شیخ ابو

---

[1] طبقات الشافعیہ جلد ا ص ۲۵۰

عبید احمد بن زیادۃ اللہ غفاری نے مکہ میں ابو مکتوم سے سنا تھا، تو میں نے ان سے اکثر حصہ سُن لیا، اور بقیہ حصہ کی انھون نے اجازت دیدی، ابو مکتوم کے واسطے سے سب سے آخر میں جس نے روایت کی ہے، وہ ابوالحسن علی بن حمید بن عمار انصاری ہیں، انھون نے بطریق اجازہ حاصل کیا تھا اور مین نے پوری کتاب اپنے استاذ ابو طالب صالح بن سند سے پڑھی جنھون نے اس کو طرطوسی سے اور طرطوسی نے ابوالولید باجی سے سنا تھا۔[1]

کتابون کی سند واجازہ میں یہ ضروری تھا کہ شیخ اپنے شیوخ کے واسطوں سے اپنی قرائت وسماع کا سلسلہ اس کتاب کے مصنف تک پہونچائے، ورنہ وہ سند لائق اعتبار نہ سمجھی جاتی تھی ایسی سندیں آج بھی عربی مدرسون میں رائج ہین،

نصاب تعلیم، اسلامی نظام تعلیم میں علوم قرآن، تفسیر، حدیث، اصول، اصول فقہ وکلام اور مناظرہ وغیرہ کی تحصیل مدرسہ کے ہر طالب علم کے لئے لازمی تھی، اور طالب علمون کے اسباق میں اسی ترتیب بالا سے انھیں پہلے اور پیچھے جگہ دیجاتی تھی، ان کے علاوہ دیگر علوم حساب، ہیئت، طب، نجوم اور زراعت وغیرہ کی تحصیل اختیاری قرار دی گئی تھی، جس طالب علم کو جس علم سے مناسبت ہوتی، وہ اسکی طرف رجوع کرتا تھا، اور اسی لئے ان علوم کی تحصیل مذہبی اصطلاح میں جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے، فرض کفایہ سمجھی جاتی تھی[2] اس کے ساتھ مختلف علوم وفنون کے معلم اس کا لحاظ رکھتے تھے، کہ وہ طالب علموں کے دلوں میں کسی خاص فن کی طرف سے حقارت کا جذبہ پیدا نہ کرین، مثلاً فقہ کا معلم علم لغت کی بُرائیان نہ کرتا، یا تفسیر اور حدیث کی تعلیم دینے والا علم فقہ کو ہلکا کرکے نہ دکھاتا تھا،

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۲۸۶،

[2] تذکرۃ السامع ص ۳۵، ۳۶

تعلیم کے طریقہ میں یہ بات لائقِ ذکر ہے کہ علوم وفنون کی تعلیم میں اساتذہ اصل مطمحِ نظر اپنے فن کے اصل قواعد اور اصول طالب علموں کو اس طرح ذہن نشین کرا دیتے تھے، کہ انھیں فن میں حقیقی بصیرت حاصل ہو، اور وہ خود سے ان کے دوسرے مسائل ان پر قیاس کر سکیں، [۱]

طلبہ کے روزانہ کے اسباق کی ایک مثال

طالب علموں کے ذمہ روزانہ بہت سے اسباق رہتے تھے، علامہ ذہبی نے امام نووی کے روزانہ کے اسباق کی فہرست حسب ذیل درج کی ہے، وہ یہ ہے،

(۱) الوسیط (۲) الوسیط (دو سبق)، (۳) کتاب المہذب (۴) الجمع بین الصحیحین حمیدی (۵) صحیح مسلم (۶) کتاب اللمع ابن جنی، (۷) اصلاح منطق، (۸) تصریف (۹) اصول (۱۰) اسمائے رجال، (۱۱) اصولِ دین،

امام نووی ان گیارہوں سبقوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے، اور ان کے تمام متعلقات مشکلات کی شرح عبارت کی توضیح اور لغتوں کے معنی وغیرہ روزانہ لکھتے بھی تھے،

بقدر استطاعت اسباق میں کمی کرنا،

اگر تعلیم کا بوجھ کسی پر زیادہ ہو جاتا تھا، تو وہ اپنی استطاعت کے مطابق اس میں کمی کر دیتا تھا، چنانچہ امام نووی کو ان اسباق کی موجودگی میں طب پڑھنے کا خیال پیدا ہوا، اور انھوں نے کتاب قانون خریدی، مگر وہ اس بوجھ کو سنبھال نہ سکے، اور علم طب کی تحصیل کا ارادہ ترک کر کے وہ کتاب فروخت کر ڈالی، [۲]

---

[۱] تذکرۃ السامع ص ۵۸، ۱۱۶ [۲] تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۲۵۱،

فنِ حدیث کی درسی کتابیں	ہر فن کی تعلیم کے لئے اس عہد تک کی تصنیف کی ہوئی معیاری کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، مثال کے طور پر فنِ حدیث کی درسیات ذیل میں پیش ہیں،

فنِ حدیث کی تحصیل کے معنی حدیث کے اسناد، رجال، معنی، لغت اور تاریخ پر عبور حاصل کرنے کے تھے،

علم حدیث کا جو کم سے کم نصاب مقرر تھا اس میں پہلے صحیح بخاری پڑھاتے تھے، پھر صحیح مسلم اس کے بعد مشہور کتابیں موطا امام مالک، سنن ابی داؤد، نسائی، ابن ماجہ، جامع ترمذی، مسند شافعی، (واحناف کو موطاے محمد) لازمی طور پر پڑھائی جاتی تھیں[1]،

خصوصاً صحاح ستہ میں سے کوئی کتاب چھوڑی نہ جاتی تھی، چنانچہ اکثر محدثین کے حالات میں ان کے پڑھنے کا ذکر آتا ہے، مثلاً امام نووی کے حالات میں علامہ ذہبی لکھتے ہیں،

کتب ستہ (صحیح بخاری[1]، مسلم[2]، سنن ابو داؤد[3]، ترمذی[4]، نسائی[5]، ابن ماجہ[6]، مسند ابن حنبل، موطا، شرح السنہ بغوی، سنن دارقطنی، اور بہت سی کتابیں سنیں[2]"،

ان صحاح وسنن کی قرأت اور سماع کے بعد علم حدیث میں بصیرت پیدا کرنے کے لئے سنن بیہقی، اور مسند احمد بن حنبل، ابن حمید و بزاز وغیرہ پڑھتے تھے کسی محدث کے لئے ان مذکورہ بالا صحاح، سنن اور مسانید سے کم پر اکتفا کرنے کی اجازت نہ تھی[3]، اسی کے ساتھ اصولِ حدیث میں چند

---

[1] تذکرۃ السامع ص ۱۲۷ تا ۱۲۹،

[2] تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۲۵۱،

[3] تذکرۃ السامع ص ۱۲۹،

کتابیں لازمی تھیں، مثلاً کتاب العلل دارقطنی، کتاب المؤتلف والمختلف امیر ابونصر بن ماکولا کتاب وفیات الشیوخ حمیدی، اور معرفۃ علوم الحدیث حاکم[۱]

پھر جو لوگ علم حدیث میں اعلیٰ بصیرت پیدا کرنی چاہتے تھے، وہ اس زمانہ میں بھی حدیث کی طلب کے لئے سفر کر کے ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے تھے، اور مختلف محدثین سے کتابیں اور روایتیں پڑھتے اور سنتے تھے، مثلاً ابن عساکر ابو اسحاق ابراہیم بن احمد نیشاپوری ان کے متعلق لکھتا ہے، "کبر سنی میں علم حدیث حاصل کیا، نیشاپور میں روایتیں سنیں، پھر نسا ر گئے، جہاں حسن بن سفیان سے مسند ابن مبارک اور مسند ابن ابی شیبہ اور انتخاب ابوبکر بن علی سنی"[۲]۔

اسی طرح اس زمانہ کے بہت سے اہل علم کے سوانح میں ایک شہر سے دوسرے شہر کو جا کر حدیثیں سننے کے حالات تذکرۃ الحفاظ ذہبی، ابنِ عساکر، ابن خلکان، الدرر الکامنہ ابنِ حجر اور شذرات الذہب ابن عماد حنبلی میں پائے جاتے ہیں،

فن حدیث کی معیاری تحصیل

فنِ حدیث کی معیاری تحصیل اور "محدث" کا لقب پانے کے لئے چند امور ضروری سمجھے جاتے تھے،

۱۔ صحیح احادیث کا معتد بہ حصہ برزبان ہو،

۲۔ حدیث کے جملہ اقسام صحیح، حسن، ضعیف و مرسل و مسند وغیرہ پر کامل عبور ہو،

۳۔ علم درایت سے پوری آگاہی ہو یعنی حدیث کے الفاظ اور معانی پر اس حیثیت سے کامل نظر ہو، کہ وہ عربی قواعد اور شرعی ضوابط کے لحاظ سے واقعی قول رسول صلعم معلوم ہو، چنانچہ ابنِ جماعہ محدث کی تعریف میں فرماتے ہیں،:۔

"محدث وہ ہے جو اسانید و علل و اسماء رجال پر حاوی ہو، متونِ حدیث نوک

---

[۱] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۱۴، ۶۱، [۲] ابنِ عساکر،

زبان ہوں، اور کتابوں میں سے صحاح ستہ مسند احمد سنن بیہقی، اور معجم طبرانی کم سے کم سُن چکا ہو۔[۱]

دیگر علوم کی درسیات، جس طریقہ سے علم حدیث کی یہ کتابیں مقرر تھیں، اسی طریقہ سے دوسرے شرعی ادبی اور عقلی علوم کا نصاب بھی مقرر تھا، ان علوم میں بھی اسی طریقہ سے مثلاً پہلے اشعار و دواوین یاد کراتے صرف ونحو کے اہم مسائل ذہن نشین کراتے، اور ادب وشعر میں ملکہ پیدا کرتے تھے، عقلیات میں بھی پہلے مبادیات حفظ کرتے، پھر کتابیں پڑھتے، ان کی شرحوں سے گذرتے، اور علوم سائنس میں بھی مبادیات کی تحصیل کے بعد عملی طور پر سائنٹفک تجربے کرتے، اور ایجادات اور اکتشافات میں لگے رہتے تھے،

مثلاً ابن ابی اصیبعہ اپنے چچا رشید الدین علی بن خلیفہ طبیب کی تحصیلِ علم کی تفصیل بیان کرتا ہے، کہ "انھوں نے پہلے ابوالنقی صالح بن احمد قرشی مقدسی سے جو بچوں کو تعلیم دینے میں ماہر تھے، قرآن مجید حفظ کیا، پھر علم حساب پڑھا، پھر جمال الدین بن ابی الحواضر کی خدمت سے وابستہ ہوکر علم طب کی تحصیل شروع کی، اور جالینوس کی کتابیں پڑھیں، اور اس فن کے مبادیات حفظ کئے، پھر اطبا کی جماعت میں حاضر رہنے لگے، اور بیمارستان میں عملی تجربہ اور امراض کی قسموں کی تعلیم حاصل کرتے رہے، اور علاج ومعالجہ کا طریقہ سیکھتے رہے، پھر اسی اثنا میں علم امراض چشم کی تعلیم حاصل کی، اور قاضی نفیس الدین ابن زبیر سے جو بیمارستان کے شعبہ چشم کے افسر اعلیٰ تھے، اس فن کو عملی حیثیت سے سیکھا، پھر اسی طرح آپریشن کرنے کی تعلیم اور مشق بہم پہنچائی، اور نیز دوسرے علوم کی مہارت کیلئے موفق الدین عبداللطیف بن یوسف بغدادی اور سدید الدین منطقی سے سلسلۂ تعلیم جاری کیا، اور ان سے ادب فلسفہ اور منطق کی تحصیل کی، نیز علوم نجوم کی تحصیل ابو محمد بن جدی سے کی، اور فن موسیقی کی تعلیم ابن دیجور مصری سے پائی، اور بیس سال کی عمر میں ان تمام علوم وفنون میں مہارت حاصل کرلی، اور

[۱] مفتاح السعادۃ جلد ۲ ص ۳ بحوالہ طبقات الشافعیہ سبکی،

شام پہونچکر مطب شروع کر دیا، اس کے بعد پانچ سال مزید تحصیل میں صرف کئے، اور پچیس سال کی عمر میں ماہر کامل بن گئے[1]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنے تحصیل علم کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اس زمانہ میں ہندوستان میں طلبہ کس ترتیب سے پڑھتے، نصاب کی کتابوں اور ان کے حواشی و شروح کے متعلق کیا سمجھتے تھے، تعلیم کی مدت کیا تھی، اور تعلیم میں اصل مطمح نظر کیا رہتا تھا، اور تعلیم و تعلّم کا کیا طریقہ رائج تھا، فرماتے ہیں:۔

"اوّل از قرآن مجید متسابقہ تعلیم فرمودند سبق در سبق ایشان می نوشتند، و من می خواندم از قرآن ہمیں مقدار تعلیم کردہ ام بعد ازان باثر تربیت و شفقت ایشان چناں قوت بہم رسید کہ ہر روز قدرے از قرآن می خواندم و ہر مقدار کہ می خواندم پیش ایشان میگذرانیدم، در دو سہ ماہ ختم قرآن تمام کردم،

و در خط و سواد چنانچہ معلمان جلیل اطفال را در مکتبہا یاد دہند، مفید نشدند، فقیر را تا فاوقاف بر طریقہ اطفال مفید شدہ نویسانیدہ باشند بعد ازان بطریق اجمال در اندک مدت شاید اگر مقدار یک ماہ تعیین کنیم دروغ نگفتہ باشم قدرت کتابت و سلیقہ انشا پیدا شد، و از کتاب ہائے نظم و اشعار کہ تعلّم آن متعارف این دیار است شاید کہ چند چیز خرد از بوستان و گلستان و دیوان حافظ تعلیم کردہ باشند، و ہم از ابتدا، حالت صغر بعد از ختم قرآن میزان صرف یاد دادند، تا مصباح و کافیہ خود تعلیم فرمودند، ...... و گاہے کتابہا را تعداد می کردند و می فرمودند ہمین چند کتاب راکہ خواندی دانشمند شدی،

می فرمودند تو یک مختصر از ہر علم بخواں ترا پسندیدہ ست، بعد ازان انشار اللہ چنان ابواب

---

[1] عیون الانبا جلد ۲ ص ۲۴۷، ۲۴۸،

برکت وسعادت برتو بکشاید، کہ جمیع علوم بے تکلف تحصیل روے نماید،...... از مختصرات نحو مثل کافیہ، ولب وارشاد، شاید کہ در بعضے اوقات یک یک جزو بلکہ بیشتر طے می نمودم بلکہ بہ سبب حرص وشوقیکہ براتمام تحصیل و فراغ داشتم، چنان بودم کہ اگر جزوے ازین مختصرات مصحح ومحشی بدست می افتاد، بگذرانیدن آن پیش اوستادنمی پرداختم، وبجلی ازمطالعہ کہ وران اوان بنظر درحواشی دست می داد اکتفا کردہ، بجزو دیگرمی انداختم... مقید نہ بودم، کہ شروع از اول کتاب باید نمود، واختتام بآخران کرد مطمح نظر تحصیل علم بود، ہر نوع کہ باشد دوازدہ یا سیزدہ سالہ بودہ ام کہ شرح شمسیہ وشرح عقائد می خواندم وپانزدہ یا شانزدہ کہ مطول ومختصر راگذراندم وپیشتر یا پستر بیک سال از عددے کہ ظرفا در شمار عمر از ذکران ملاحظہ کنند از علوم عقلی ونقلی انچہ درافادہ واستفادہ از صورت ومادہ کافی ووافی باشد تمام کردم، ...... وباالجملہ ہمیں قیاس کہ برخواندم برسائر کتب عبوری کردم وعشوری نمودم، غیر آنکہ مدت ہفت ہشت سال بلکہ زیادہ بعد از رسیدن بکتب عربیت ومنطق وکلام وحصول نوعے از قوت اکمال واتمام ملازمت درس بعضی از دانشمندان ماوراء النہر بطورے نمودہ شد کہ در تمامی شب وروز شاید کہ دو سہ ساعت از مطالعہ وتعقل واشتغال فرصتے دست نمی دادہ باشند[1]

مولٰینا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے رسالہ وصیت نامہ میں تعلیم کے طریقہ اور کتابوں کی ترتیب پر خیالات ظاہر کیے ہیں، کہ یہ ان کا آزمودہ طریقہ ہے، اس سے اس زمانہ میں ہندوستان کے تعلیمی طریقے اور کتابوں کی ترتیب پر روشنی پڑتی ہے، مولانا ابوالحسنات صاحب ندوی مرحوم نے اسے اپنے رسالہ اسلامی درسگاہیں میں نقل کیا ہے، اسو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:-

[1] اخبار الاخیار ص ۲۹۰ تا ۲۹۲،

"طریق تعلیم علم چنان کہ بہ تجربہ محقق شد آن ست کہ نخست رسائل مختصرہ صرف و نحو درس گویند سہ نسخہ از ہر یکے یا چہار چہار بقدر ذہن طالب بعد ازان کتابے از تاریخ یا حکمت عملی کہ بزبان عربی باشد آموزند و دران میان بطریق تتبع لغت و برآوردن مشکل از جائے آن مطلع سازند، چون قدرت بزبان عربی یافت مؤطا بروایت یحییٰ بن یحیی مصمودی بخوانانند، و ہرگز آن را معطل نگذارند، کہ اصل علم حدیث ست، و خواندن آن فیضہا دارد ما را سماع جمیع آن مسلسل ست، بعد ازان قرآن عظیم درس گویند، بآن صفت کہ صرف قرآن خواند، بغیر تفسیر و ترجمہ گوید و آنچہ مشکل باشد، در نحو، یا در شان نزول متوقف شود و بحث نماید، بعد فراغ از درس تفسیر جلالین را بقدر درس بخواند، و درین طریق فیضہا است بعد ازان در یک وقت کتب حدیث بخواند مانند صحیحین و غیر آنہا و کتب فقہیہ و عقائد و سلوک و در یک وقت کتب دانشمندی مثل شرح ملا جامی و قطبی و غیر آن الا ماشاء اللہ و اگر متیسر آید کہ مشکوٰۃ را یک روز بخواند در روز دیگر شرح طیبی بقدر آنچہ روز اول خواندہ است بخواند خیلے نافع ست[1]"

تکمیل علوم کے چند لازمی طریق ساتویں آٹھویں صدی میں طالب علموں کے لئے فنون کے مبادیات کے حفظ کرنے کے بعد مختلف فنون کی تکمیل کیلئے حسب ذیل طریقوں پر عمل کرنا ضروری تھا، اور تاوقتیکہ کوئی طالب علم ان منزلوں سے گذر نہ لے اسے صاحب فن کا درجہ حاصل نہ ہوتا تھا،

۱۔ اساتذہ کے درس کے حلقہ میں زبانی خطبوں کا سلسلہ اس عہد میں بھی جاری تھا، طلبہ ان میں التزام سے شریک ہو کر املا کرتے تھے،

۲۔ اس عہد میں اساتذہ سے ہر فن کی اہم کتابوں کے سبقاً سبقاً پڑھنے کا طریقہ جاری ہو گیا

---

[1] اسلامی درسگاہیں، ص ۱۰۸،۱۰۷،

تھا، اور طالب علموں کے لئے ضروری تھا، کہ وہ ہر فن کی معیاری (کلاسیکل) کتابیں استادوں سے پڑھیں، اور ان کی قرأت اور سماع کی سند اور اجازت حاصل کریں،

۳- طلبہ کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا، کہ وہ اپنے استادوں سے اجازت لینے کے بعد علم کی تحصیل کے لئے دور دراز کے سفر طے کریں، چنانچہ طلبہ اپنی جماعت کی جماعت تیار کرتے تھے، اور مختلف شہروں میں گھوم کر وہاں کے ممتاز اہلِ علم سے علوم میں بصیرت پیدا کرتے تھے،

۴- ہر طالب علم کے لئے اپنے عہد کے بلند پایہ مصنفین سے شاگردی کا شرف حاصل کرنا ضروری تھا، اس کے مدرسہ کے جو اساتذہ صاحب تصانیف ہوتے، ان سے انکی کتابیں پڑھ کر ان کی قرأت اور سماع کی سند حاصل کرتے تھے، پھر اپنے علمی سفروں میں زیادہ تر علم کی تحصیل اسی ذریعہ سے کرتے، ہر شہر میں جو ممتاز اساتذہ اور مصنفین ہوتے تھے ان کے درس کے حلقہ میں شریک ہو کر ان کی کتابوں کی اجازت و سند حاصل کرتے تھے، کسی کتاب کا پڑھنا، اس وقت تک معتبر نہ سمجھا جاتا تھا، جب تک اس کے مصنف سے یا اس کے شاگرد، یا شاگردوں کے شاگرد سے اس کے پڑھنے کی اجازت حاصل نہ کر لی جاتی،

۵- طلبہ جب تک علوم میں پوری بصیرت پیدا نہ کرتے، وہ اختلافی مسئلوں کا مطالعہ نہ کرتے تھے، جب انھیں اپنے علم پر بھروسہ ہو جاتا، تو پھر نظر کو زیادہ وسیع کرنے کے لئے خلافیات کا مطالعہ کرتے تھے،

۶- جب علمی استعداد کمال کے درجہ پر پہونچ جاتی، اور فن کی اکثر کتابیں نگاہوں سے گذر جاتیں تو پھر درس و افتاء کی مسند پر بیٹھتے تھے، اور اپنی تصنیف اور تالیف کے ذریعہ سے فیض جاری کرتے تھے، اسی سلسلہ میں علمائے اسلام کے اختلافی مسئلوں پر تحقیق کی نظر ڈالتے تھے، اور اگر ضرورت ہوتی تو ان خلافیات پر اپنی تصنیفات میں مصنفانہ نظر ڈالنے کی کوشش کرتے تھے[1]

[1] تذکرۃ السامع ص ۱۳۳ تا ۱۴۲ و ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۹-

(۸)

طرزِ تعلیم و نصابِ درس کی چند خامیاں اور انکی اصلاح کی کوششیں

امتدادِ زمانہ سے طرزِ تعلیم و نصابِ درس میں چند خامیاں اور انکی اصلاح کی کوششیں

امتدادِ زمانہ سے اسلامی طرزِ تعلیم و نصابِ درس میں چند خامیاں پیدا ہوئیں اور مختلف زمانوں میں ان کی اصلاح کی کوششیں کی گئیں، جب اسلامی حکومتوں کے شباب کا دور آیا، اور علما بھی حکومت کے مختلف منصبوں، افتا، قضا، خطابت اور اوقاف کی تولیت وغیرہ پر مقرر کئے جانے لگے، تو چوتھی پانچویں صدی ہجری سے لوگوں کی توجہ علم فقہ پر زیادہ مبذول ہو گئی تھی، اس کے علاوہ فقہ میں مختلف مذہبوں کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے خلافیات کے نام سے اس علم میں ایک مستقل باب کا اضافہ ہو گیا تھا، اور تعلیم و تعلم میں بھی انہی چیزوں پر توجہ کیجانے لگی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ مدرسوں کے نصابِ تعلیم میں خلافیات کے رسائل زیادہ داخل ہو گئے، اور دوسرے علوم کی طرف توجہ کم ہو گئی،

امام غزالی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ان خامیوں کا احساس کیا، اور احیاء العلوم میں ان پر تفصیل سے نظر ڈال کر ان کی اصلاح کی تدبیریں بتائیں جنھیں مولینا شبلی مرحوم نے "تعلیم کی اصلاح" کے عنوان سے الغزالی میں مفصل بیان کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:-

۱۔ امام غزالی نے مذہبی اور غیر مذہبی علوم کی تقسیم کر کے جو مختلف علوم مذہبی سمجھے جانے لگے تھے، ان کی تردید کی، اور ضروری علوم پر متوجہ کیا،

۲۔ خصوصاً علم فقہ کو جو اس زمانہ میں معیشت کے حاصل کرنے کا ذریعہ بن گیا، دنیاوی علوم میں شمار کیا،

۳۔ شرعی علوم کے غلط استعمال سے روکا،

۴۔ فقہی و کلامی مناظروں سے باز رکھ کر صحیح علم کلام کے حاصل کرنے کی تلقین کی،

۵۔ ان شرعی علوم کے لئے ایک مختصر نصاب تعلیم تیار کیا جن کی تحصیل مسلمانوں کے لئے ضروری ہے،

امام غزالی کی اصلاح کی اس آواز کا نتیجہ آگے چل کر مولینا شبلی مرحوم کے الفاظ میں حسب ذیل ظاہر ہوا :۔

"تعلیم کے نصاب میں فقہ وکلام کے ساتھ منطق و فلسفہ داخل ہو گیا، دنیوی علوم کے لئے اتنا کافی وقت نکل آیا، کہ فقہاء و محدثین بھی ریاضی دان اور حساب دان ہونے لگے، فقہ میں سے علم اختلافیات کا حصہ بالکل خارج ہو گیا، کلام کے بہت سے غیر ضروری مباحث چھٹ گئے۔[۱]"

پھر آٹھویں صدی میں علامہ ابن خلدون نے چند اصلاحیں پیش کیں، ان سے اس عہد کی خامیوں کا بھی اندازہ ہوگا، مثلاً

۱۔ تعلیم کی ابتداء قرآن مجید سے شروع کرنے کا عام رواج اصلاح کے قابل ہے،

۲۔ جو علوم دوسرے علوم کے حاصل کرنے کے ذرائع ہوں، ان میں نہ زیادہ وقت نظر پیدا کیجائے، اور نہ اس کے فروعی مسئلوں پر وقت صرف کیا جائے،

۳۔ کتابوں اور علوم کے جو مختصرات تیار کئے گئے ہیں، ان پر علم کی تحصیل کی بنیاد نہ قائم کیجائے،

۴۔ ایک ہی فن کی ایک ہی قسم کی بہ کثرت کتابیں پڑھانا نہ صرف تضیع اوقات بلکہ مانع تحصیل علم ہے،

تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے : بچوں کی تعلیم قرآن مجید سے شروع کرانے کا طریقہ اگرچہ تمام اسلامی ملکوں میں رائج تھا، لیکن بعض اہل علم اُسے اسلئے محل نظر سمجھنے لگے تھے، کہ بچوں کو ان کی بے سمجھی کے زمانہ میں خدا کی کتاب پڑھائی جائے، چنانچہ ابن خلدون نے قاضی ابوبکر ابن عربی کے حوالہ سے اس مسئلہ پر ذیل کے خیالات ظاہر کئے ہیں :۔

---

[۱] الغزالی از ص ۲۱۱ تا ۲۲۰، ان مباحث کی تفصیل کے لئے دیکھئے احیاء العلوم جلد ۱، از ص ۹ تا ۳۲،

"قاضی ابو بکر بن عربی نے اپنے سفر نامہ میں طرز تعلیم کے متعلق ایک نادر طریقہ پیش کیا ہے، وہ عربیت اور شعر کی تعلیم کو تمام علوم کی تعلیم پر مقدم کرتے ہیں، جیسا کہ تقریباً اہل اندلس کا طریقہ ہے، وہ کہتے ہیں کہ پہلے شعر و ادب کی تعلیم دینا چاہیئے، پھر حساب لکھا کر اسکی مشق کرانی چاہیئے، یہانتک کہ وہ اصول و قوانین کو سمجھ سکے، اس کے بعد قرآن پڑھانا چاہیئے، کیونکہ اس ترتیب سے پڑھنے سے قرآن اس کے لئے آسان ہو جائے گا، پھر وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہموطنوں کی غفلت پر ماتم ہے، کہ وہ بچہ کے ہاتھ میں شروع ہی میں خدا کی کتاب پکڑا دیتے ہیں، اور وہ ایسی چیز پڑھتا ہے، جسے بالکل نہیں سمجھ سکتا

اس کے بعد وہ کلام پڑھانے کے لئے کہتے ہیں، پھر اصول فقہ، پھر مناظرہ، اس کے بعد علوم حدیث کا درجہ دیتے ہیں،

اس کے ساتھ دو علموں کو ملا کر پڑھانے کی ممانعت کرتے ہیں، البتہ اگر طالب علم اپنی تیزی اور ذکاوت سے اس قابل ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔"

اس کے بعد وہ یہ رائے ظاہر کرتا ہے، کہ

درحقیقت یہ ایک عمدہ طریقہ تعلیم ہے، لیکن جو عادتیں جاری ہیں، ان کا بدلنا دشوار ہے، اور لوگ قرآن مجید کی تعلیم کو مقدم تبرک اور ثواب کی نیت سے کرتے ہیں، اس کے علاوہ ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے، کہ یہ خطرہ رہتا ہے کہ آگے چل کر ممکن ہے بچہ کی تعلیم جاری نہ رہ سکے تو قرآن کی تعلیم کا موقع نہ مل سکے گا، خصوصاً اس لئے کہ بچے بچپن میں والدین کے مطیع رہتے ہیں، بالغ ہونے کے بعد والدین کا اختیار ان پر باقی نہیں رہتا، اس لئے اگر وہ تعلیمی سلسلہ کو منقطع کر دین گے، تو قرآن کی تحصیل کا فرض باقی نہ رہ جائے گا،

لیکن جب بچہ کے متعلق یہ یقین ہو کہ اس کا تعلیمی سلسلہ منقطع نہ ہو گا، تو قاضی ابو بکر نے

جو طریقہ تعلیم بیان کیا ہے اسے اختیار کرنا بہتر ہوگا"۔[ل]

علوم غیر مقصود بالذات کو مقصود بالذات بنانے کی مخالفت

ابن خلدون ان علوم پر جو دوسرے علوم کے پڑھنے کے وسیلہ کے لئے پڑھائے جاتے ہیں، اور جنھیں اس نے علوم آلیہ کی اصطلاح سے یاد کیا ہے کم توجہ کرنے کی ہدایت کرتا ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"متداول علوم کی دو قسمیں ہیں، ایک مقصود بالذات ہیں، جیسے، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام طبیعیات، الٰہیات، اور ایک وہ علوم ہیں جو ان کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں، جیسے قواعد عربی، حساب منطق، پس جو علوم مقصود بالذات ہیں، اگر ان میں کلام کو وسعت دیجائے، تو کوئی حرج نہیں، لیکن جو علوم دوسرے علوم کا آلہ ہیں، جیسے قواعد عربی اور منطق وغیرہ تو ان کو صرف اسی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے، کہ وہ آلہ ہیں، اس لئے ان میں کلام کو وسعت نہ دینی چاہیئے، کیونکہ اس سے ان کا اصل مقصد فوت ہوجائے گا، اور علوم مقصود بالذات کی تحصیل میں رکاوٹ پیدا ہوگی، حالانکہ وہی اہم ہیں، اور اس طریقہ سے طالب علم کی عمر ان سب کی تحصیل کے لئے کافی نہ ہوگی، کیونکہ ان علوم آلیہ کی مصروفیت میں عمر ضائع ہوجائیگی، جیسا کہ متاخرین نے نحو، منطق، اور اصول فقہ کے متعلق کیا ہے"۔[۲]

مختصرات سے اجتناب

ہر فن کے مسئلوں کے سمیٹنے کے لئے "مختصر" کے نام سے جو رسالے لکھے جاتے تھے، ان کے متعلق کہتا ہے:۔

"اکثر متاخرین نے علوم وفنون کے طریقے کو مختصر کردیا ہے، اور ہر علم کی ایک مختصر سی فہرست مرتب کرلی ہے، جو مختصر لفظوں میں اس کے تمام مسئلوں اور دلیلوں پر مشتمل ہوتی ہے، ان لوگوں نے تفسیر اور بیان کی بڑی کتابوں کا اختصار کرلیا ہے، جیسا کہ ابن حاجب نے فقہ و

[ل] مقدمہ ابن خلدون ص ۶۱۰، ۶۱۹، [۲] ص ۶۱۵

اصول فقہ میں ابن مالک نے قواعد عربی اور خونجی وغیرہ نے منطق میں کیا ہے، لیکن تعلیم کا یہ طریقہ نقصان دہ ہے، اور اس سے تحصیل میں خلل پڑتا ہے، تمام خرابیوں کے ساتھ طالبعلم کے لئے بڑی دشواری یہ ہے کہ انھیں مشکل اور مختصر الفاظ کا تتبع کرنا پڑتا ہے، اور ان میں سے دشواری کے ساتھ مسائل کو نکالنا پڑتا ہے، ان تمام خرابیوں کے علاوہ ان "مختصرات" کی تعلیم سے جو ملکہ علمی حاصل ہوتا ہے، وہ اس ملکہ سے ناقص ہوتا ہے، جو طویل الذیل کتابوں کے پڑھنے اور ایک بات کے بار بار دہرانے سے حاصل ہوتا ہے"۔[1]

ایک ہی فن کی بہ کثرت کتابوں کی تعلیم کے نقصانات

ایک ہی فن کی بہ کثرت کتابیں پڑھنے کی مخالفت میں اس نے دکھایا ہے، کہ کتابوں کی زیادہ تصنیف علم اور تعلیم کی ترقی میں مانع ہے، لکھتا ہے:-

"لوگوں کو علم کی تحصیل میں جس چیز نے نقصان پہنچایا ہے، وہ کتابوں کی کثرت، اصطلاحوں کا اختلاف تعلیم کے طریقوں کا متعدد ہونا، اور پھر طالب علم سے ان کے یاد کرنے کا مطالبہ کرنا ہے، جو کچھ ایک فن کے متعلق لکھا گیا ہے، طالب علم کی عمر اسی کا ساتھ نہیں دے سکتی، اسلئے علم کی تحصیل میں خواہ مخواہ کوتاہی واقع ہوتی ہے، فقہ مالکی میں اس کی مثال مدونہ اور اس کی شرحیں ہیں، ابن یونس لخمی ابن بشیر وغیرہ کی کتابیں اور تنبیہات و مقدمات بیان وغیرہ، یہی حال، ابن حاجب کی کتابوں اور اس کی شرحوں کا ہے، یہ تمام کتابیں مکرر ہیں، اور معنی سب کے ایک ہیں، لیکن طالب علم سے سب کے یاد کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور عمر صرف ایک ہی کتاب میں گذر جاتی ہے،

اگر اساتذہ صرف مذہبی مسائل پر اکتفا کرتے، تو تعلیم آسان ہو جاتی، اور اس کا ماخذ قریب ہو جاتا"۔[2]

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۶۱۰، [2] ،، صفحہ ۶۰۹،

طریقۂ تعلیم کے متعلق ابنِ خلدون کے چند مفید مشورے

ابنِ خلدون نے طریقۂ تعلیم کی مذکورۂ بالا خامیاں مٹانے کے علاوہ چند مفید مشورے بھی دیئے ہیں، جو اجمالاً حسبِ ذیل ہیں، لکھتا ہے:

"طالب علموں کے لئے علوم کی تلقین اسوقت مفید ہو سکتی ہے، جب وہ تھوڑا تھوڑا تدریجاً پڑھائے جائیں، پہلے ہر فن کے چند اصولی مسئلے ذہن نشین کرائے جائیں، پھر اجمال کے ساتھ ان کی شرح بیان کی جائے، اور اس میں ان کی قوتِ فہم اور استعداد ملحوظ رکھی جائے، یہاں تک کہ فن کے آخری حصے انھیں سمجھائے جائیں، اس وقت ان میں اس فن کے متعلق ایک قسم کا ملکہ پیدا ہوگا، اور اس کی غایت یہ ہوگی، کہ وہ اس فن کے سمجھنے اور اس کے مسائل حاصل کرنے کے لئے تیار ہو جائیں، پھر دوسرے فن کی جانب رجوع کیا جائے، اور اسی ترتیب سے وہ فن بتدریج انھیں پڑھایا جائے، اور پھر شروح وغیرہ سے گذر کر اس کے اختلافی مسائل سمجھائے جائیں، یہانتک کہ وہ فن کو پورے طور پر حاصل کر لیں، اور اس طریقہ سے تدریجاً ان میں عمومی علمی ملکہ پیدا ہو جائیگا، ورنہ اگر شروع ہی میں انتہائی مسائل ان پر بار کر دیئے جائیں گے، تو رفتہ رفتہ ان کی طبیعت چھوٹ جائے گی اور بالآخر وہ تعلیم سے منہ موڑ لیں گے۔"

اسی طرح فنون کی تحصیل میں ناغہ کرنا مناسب نہیں، ورنہ اس کی وجہ سے فن کا آخری حصہ اوّل سے منقطع ہو جائیگا، اور طلبہ کو دشواری پیش آئیگی، اور پراگندگیِ خاطر لاحق ہوگی۔[۱]

قاضی ابن جماعہ نے بھی اپنی کتاب میں جا بجا مفید تعلیمی مشورے دئے ہیں، جیسے تعلیم کیلئے اساتذہ کو بار بار نہ بدلا جائے، ایک کتاب میں پوری بصیرت حاصل کر لیجائے، پھر دوسری کتاب شروع کیجائے[۲]، کتابوں کو حفظ کرنے سے پہلے ان کی دیکھ بھال کر پوری تصحیح کر لیجائے[۳] علم

۱؎ مقدمہ ابن خلدون ص ۶۱۱ ۲؎ تذکرۃ السامع ص ۱۱۳ ۳؎ ایضاً ص ۱۲۱

کو کتاب میں منحصر نہ سمجھا جائے، کیونکہ علم صرف کتاب سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ استاذ سے شکوک رفع کرنے اور خود تحقیق و تفتیش کرنے سے مسائل حل ہوتے ہیں[1] اور دو فنون بیک وقت حاصل نہ کئے جائیں، بلکہ یکے بعد دیگرے پڑھنا چاہیئے[2]

عالمِ اسلامی میں جدید تعلیمی انقلاب

اسلامی طریق تعلیم کی جن خامیوں کی طرف امام غزالی اور علامہ ابن خلدون نے توجہ دلائی ہے، وہ دور اخیر تک ہندوستان کی اسلامی درس گاہوں میں بھی باقی تھیں، خصوصًا نصاب تعلیم میں غیر معمولی ابتری پیدا ہو گئی تھی، طالب علموں کی عمریں علومِ آلیہ ہی کے پڑھنے پڑھانے میں ضائع کر دیجاتی تھیں، اور شرعی علوم قرآن، حدیث اور نقد رجال وغیرہ پر کم توجہ صرف کیجاتی تھی، فقہ و کلام میں بھی سارا زور خلافیات پر صرف ہوتا تھا، اور فقہی اور کلامی مسائل پر علماء کی باہم تفسیق و تکفیر کی عام گرم بازاری تھی، پھر جدید علوم و فنون کی تحصیل اگر کفر نہیں تو درجہ فسق تک علی گڈھ کی جدید تعلیمی تحریک کے باوجود باقی رہ گئی تھی، کہ اسی اثناء میں مجلس ندوۃ العلماء کی صدائے اصلاح بلند ہوئی، اور اس کی توجہ خصوصًا ذیل کے اہم مسائل پر مرکوز رہی،

۱- نصاب تعلیم کی اصلاح کرنا،

۲- باہمی فرقہ وارانہ اختلافات اور ایک دوسرے کی تفسیق و تکفیر کو روکنا،

۳- بقدر ضرورت دینی علوم کیساتھ نئے فنون کی تعلیم دینا،

پھر ان مقاصد کے پورے طور پر حاصل کرنے کے لئے اس مجلس نے دار العلوم ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی، تاکہ ان اصولوں کے بموجب تعلیم کا صحیح طریقہ رائج ہو، دار الاقامہ کے لڑکوں کی اسلامی اخلاق کے بموجب تعلیم و تربیت کیجائے، اور اس مدرسہ کے فارغ التحصیل علماء ملت کی نئی ضرورتوں سے آشنا رہکر انھیں پوری کریں،

[1] تذکرۃ السامع ص ۱۲۳ و ۱۴۴ [2] ،، صفحہ ۵۷،

یہ شکر کا مقام ہے، کہ آج نصف صدی کے بعد ہندوستان میں اس مجلس کی اصلاح کی صدا کے نتائج ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں، آج ہندوستان میں نہ صرف دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم کا نیا نصاب جاری ہے، بلکہ تدریجاً دوسرے اسلامی مدرسوں نے بھی کم وبیش اوسکی یہ دعوت قبول کر لی ہے، اور ہر مدرسہ کے نصاب تعلیم میں کچھ نہ کچھ تبدیلی رونما ہو چکی ہے،

فرقہ وارانہ اختلافات اور باہمی تفسیق وتکفیر فقہ اور کلام کے خلافیات کے باب سے پیدا ہوئے تھے، ندوۃ العلماء کو اسکے دوسرے مقصد میں بھی کامیابی حاصل ہوئی، چنانچہ ہندوستان کے مختلف اسلامی فرقہ والوں میں باہمی رواداری کا تخیل پیدا ہو چکا ہے، اور تکفیر وتفسیق کے باب میں اگرچہ علماء زمانہ کی زبانیں اب بھی کبھی کبھی کھل جاتی ہیں، اور مکفرین کا ایک مختصر گروہ مستقل طور پر موجود ہے، تاہم انکے فتووں کا اثر حرف زبان قلم سے نکل کر صفحۂ قرطاس پر بدنما داغوں کے چھوڑ جانے کے سوا اور کوئی ظاہر نہیں ہوتا، اسلامی ہند کا سنجیدہ خیال تعلیم یافتہ طبقہ تکفیر کے ان فتووں کو وقعت نہیں دیتا، اور یہ فاسد عقائد کی اصلاح کرنیکے بجائے تمسخر واستہزا کا ذریعہ بن جاتے ہیں،

اسی طرح اسے تیسرے مقصد میں بھی کامیابی حاصل ہوئی، چنانچہ آج ملک میں ندوۃ العلماء کے بہ کثرت اور دوسرے مدارس کے خال خال فارغ التحصیل علما، قدیم وجدید دونوں علوم کے حامل نظر آتے ہیں،

اسی طرح دیگر اسلامی ممالک میں بھی تعلیمی انقلاب برپا ہوئے کہیں ندوۃ العلماء کی صدائے بازگشت کے طور پر، اور کہیں زمانہ نے ہوا کا رُخ خود پلٹ دیا، مصر میں شیخ جمال الدین افغانی مرحوم کے مسندنشین علامہ رشید رضا نے جنھوں نے اسی سال اس دار فانی کو الوداع کہا، نہ صرف ہندوستان آکر ندوۃ العلماء کی تحریک میں عملی حصہ لیا، بلکہ مصر واپس جا کر انھوں نے دار الدعوۃ دار الارشاد کے نام سے انہی مقاصد کیساتھ ایک دار العلم قائم کیا، پھر مصر کی قدیم اور مستند اسلامی درسگاہ جامعہ ازہر کے علما نے بھی ہوا کا رُخ پہچانا، اور نئی اصطلاحات قبول کر کے اسے نئی شاہراہ پر

لائے، اسی طرح مصر میں دوسرے نئے مذہبی مدارس اسکندریہ (زمانہ تعمیر ۱۹۱۳ء) اسیوط (۱۹۱۵ء) زقازیق (۱۹۲۵ء) وسوق و دمیاط وغیرہ تعلیمی مجلس کی نگرانی میں نئے طریق پر تعلیمی خدمت انجام دے رہے ہیں،

عراق میں جامعہ آل البیت کی بنیادیں استوار ہو چکی ہیں کہ دار العلم بغداد میں مدرسہ نظامیہ و مستنصریہ کا منظر پھر سامنے آجائے،

تیونس کا جامعہ زیتونیہ محمد بن ابی شنب جیسے صاحب علم کی مدد سے ترقی کے مدارج طے کر رہا ہے،

ٹرکی میں جدید دور جمہوریت کیساتھ تعلیمی انقلاب بھی برپا ہو چکا ہے، اور اب وہ غیر ممالک کے تعلیمی مرکزوں کا محتاج نہیں رہ گیا ہے،

ایران رضا شاہ پہلوی کے سایہ میں تعلیمی ترقیوں میں مصروف ہے، اور اب دانشگاہ ایران سے علوم و فنون کی نئی روشنی پھیل رہی ہے،

ہمارا ہمسایہ ملک افغانستان بھی تعلیم کے لئے کوشش کر رہا ہے، اور کابل یونیورسٹی کی بنیاد پڑ چکی ہے،

۱۹۳۳ء کی ایک اور نئی کتاب

ہندوستان کی کہانی،

یہ ہندوستان کی تاریخ کا چھوٹا سا رسالہ ہے، جو نہایت آسان اور سہل زبان میں لکھا گیا ہے، تاکہ مکتبوں اور ابتدائی مدرسوں کے بچے آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکیں، امید ہے کہ یہ رسالہ چھوٹے بچوں کے نصاب میں رکھا جائے گا، اور مدرسوں اور مکتبوں میں پڑھایا جائیگا، مصنفہ مولوی عبد السلام صاحب قدوائی ندوی،

"منیجر"

Allama Iqbal Library
19049

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں

از

مولوی ابوالحسنات صاحب مرحوم

ہندوستان کی قدیم تاریخی کتابوں میں مرتب طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی حالات اور ان کے مدرسوں اور تعلیمگاہوں کا حال معلوم کرنا چاہیں تو نہیں ملسکتا، مولوی ابوالحسنات صاحب مرحوم نے نہایت تحقیق و تلاش کے بعد ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہوں پر ایک مقالہ مرتب کیا تھا، جو اہل نظر کو بیحد پسند آیا، اب دار المصنفین نے اسی مقالہ کو کتابی صورت میں نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے،

ضخامت ۱۳۴ صفحے   قیمت :- ۱۲ار

مسعود علی ندوی منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

(طابع و ناشر محمد اویس ندوی)

THE JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY
LIBRARY.

DATE LOANED

Class No. ۲۹۲ ۳۷۰۶۰۰۱۳۹۹ Book No. ۱۵۳۸

Vol. ______ Copy ______

Accession No. ۱۹۰۷۹

Title اسلامی نظام تعلیم۔

Author ریاست علی ندوی۔

Accession No. ۱۹۰۵۹

Call No. ۳۷۰۰۹۰۰۱۲۹۲ ~~۲۹۲~~ ۱۵۲۸

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

e Jammu & Kashmir
University Library,
Srinagar.

1. Overdue charge of *one anna* per-day will be charged for each volume kept after the due date.

2. Borrowers will be held responsible for any damage done to the book while in their possession.